قیمت: پانچ روپے

ہندو احیا پسندی

کے طوفان کا اندیشہ

Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price
AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRI LANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	60p.
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	$1.25

پولیس نے مجھے ننگا کیا، جلتی شمع سے نازک اعضا کو داغا اور بجلی کے جھٹکے دیئے

ایک کشمیری نوجوان پر دہلی پولیس کی بربریت کی داستان

دو ماہ پولیس حراست میں رہنے کے بعد کشمیری تاجر ۲۵ سالہ طارق بھٹ کی زندگی پہلے جیسی نہیں رہی۔ طارق کو پولیس نے حزب المجاہدین کا ممبر بتا کر گرفتار کیا تھا۔ اسے اب اندیشہ ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ ۹ دسمبر کو ہائی کورٹ نے اسے تمام الزامات سے بری کر دیا۔ لیکن اس خبر کو سننے کے بعد طارق یہ نہیں طے کر سکا کہ اسے خوش ہونا چاہئے یا افسردہ۔ وجہ یہ ہے کہ اسے حراست کے دوران زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

کورٹ کی کارروائی کے ریکارڈ سے دہلی اور جموں و کشمیر دونوں کی پولیس کا مکروہ چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ بعض اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران طارق نے کہا کہ اس سے ایک اعتراف نامے پر دستخط کرانے کے لئے پولیس نے اسے پہلے ننگا کیا، پھر جلتی شمع سے اسے داغا اور الیکٹرک شاٹ لگایا۔ طارق کا کہنا ہے کہ پولیس اس سے یہ اعتراف کرانا چاہتی تھی کہ اس نے مختلف حملوں میں بی ایس ایف کے آٹھ جوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

طارق کی گرفتاری کے وقت دہلی پولیس کمشنر نکھل کمار نے کہا تھا کہ وہ جموں و کشمیر پولیس کو مختلف مقدمات میں مطلوب تھا۔ لیکن دو ماہ بعد

خود حکومت کے وکیل نے عدالت میں یہ کہا کہ طارق کے خلاف اس کے پاس کوئی شکایت نہیں ہے جس کے بعد ہائی کورٹ نے اسے بری کر دیا۔

طارق کا کہنا ہے کہ پولیس کا یہ دعوی غلط ہے کہ اسے ۱۲ ستمبر کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے دراصل تین دوسرے افراد کے ساتھ ۲۲ اگست کو حراست میں لیا گیا تھا۔ اس کے بعد دو ماہ تک مسلسل اس سے تفتیش کی گئی جس کے دوران اس پر غیر انسانی تشدد روا رکھا گیا۔

طارق کشمیری قالینوں کی تجارت کرتا تھا۔ اس کی گرفتاری کے وقت پولیس نے دو قالینیں اور کچھ کپڑے بھی ضبط کئے تھے۔ اس کے بعد اسے اشوک وہار پولیس اسٹیشن لے جایا گیا جہاں رات بھر اس پر تشدد کیا گیا۔ پولیس اس سے یہ اعتراف کرانا چاہتی تھی کہ وہ حزب المجاہدین کا ممبر ہے۔ لیکن جب اس نے اس سے انکار کیا تو تشدد کے گھناؤنے طریقے اختیار کئے گئے۔ پہلے ربر کی چھڑی سے اس کی مرمت کی گئی تھی لیکن جب اس نے اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات سے مسلسل انکار کیا تو اس کی دونوں ٹانگیں دو مختلف سمتوں میں پھیلا دی گئیں اور اس کے نازک اعضاء کو آگ سے داغا گیا جس سے اس کا ہوش جاتا رہا۔ وہ جب بے ہوشی سے بیدار ہوا تو بھی اپنے کو اسی حالت میں پایا۔ اس پورے تشدد کے دوران تفتیشی آفیسر اس سے کہتے کہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے تاکہ تمہیں اس تکلیف سے اور ہمیں تمہیں مارپیٹ کی زحمت سے نجات مل جائے۔

طارق کا الزام ہے کہ اسے بعض دوسرے طریقوں سے بھی ستایا گیا۔ اسے ٹانگیں پھیلا کر ایک لوہے کی چھڑی پر بیٹھنے کو کہا گیا جو دو میزوں سے لگی ہوئی تھی۔ پھر اس کے نازک اعضاء کے نیچے جلتی ہوئی قندیل رکھ دی گئی جس کی آنچ اسے جلائے دے رہی تھی۔ پھر اسی حالت میں ڈنڈے سے اس کی مسلسل پٹائی کی جاتی رہی۔ بالآخر طارق نے ان سارے جرائم کا اعتراف کر لیا جنہیں اس نے کبھی کیا بھی نہیں تھا۔

دہلی پولیس کے علاوہ جموں و کشمیر پولیس نے بھی طارق کی تفتیش کی۔ لیکن بم کے دھماکوں میں ملوث ہونے کے طارق کے اعتراف کے باوجود کشمیر پولیس اس سے اس ضمن میں سوال کرنے کے بجائے اس سے یہ پوچھتی رہی کہ اس نے کس سے اور کہاں تربیت حاصل کی۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ دہلی اور کشمیر دونوں پولیس پہلے سے اخذ شدہ نتائج کی روشنی میں طارق کی تفتیش کر رہی تھیں جس کے دوران انہوں نے اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک اور تشدد روا رکھا۔

دہلی پولیس نے طارق پر تشدد کی تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہے تو طارق نے کورٹ کو اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ ظاہر ہے کہ پولیس یہ بات اس لئے کہہ رہی ہے کہ مہینوں گزر جانے کے بعد طارق اپنے اوپر تشدد کے نشانات نہیں دکھا سکتا۔ لیکن کیا پولیس یہ بتا سکتی ہے کہ طارق کے بھیانک جرائم میں ملوث ہونے کے اعتراف کے باوجود اس کے خلاف عائد مقدمات کیوں اٹھا لئے گئے۔

•

ادریس میاں سے لیکر سبھاش داس تک

مغربی بنگال میں زیر حراست اموات کا لامتناہی سلسلہ

کلکتہ کی پولیس حراستی اموات کے تعلق سے بہت بدنام ہے۔ یوں تو پورے ملک کی پولیس کا ڈھراہی بگڑا ہوا ہے۔ پولیس کا نام آتے ہی ذہن میں ایک خونخوار اور وحشت ناک قوم کا تصور گردش کرنے لگتا ہے لیکن کلکتہ کی پولیس بقیہ علاقوں کی پولیس سے بھی آگے ہے۔ اسے اگر جلادوں کا گروہ کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ وہاں اکثر و بیشتر پولیس حراست میں اموات کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور ان کے خلاف مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔ مظاہروں سے خوف کھا کر مغربی بنگال کی حکومت چھوٹے موٹے اقدامات بھی کر لیتی ہے لیکن وسیع پیمانے پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے اور پولیس کی کارکردگی پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔

انسانی حقوق کے قومی کمیشن کا کہنا ہے کہ اپریل ۱۹۹۴ء سے مئی ۱۹۹۵ء تک ملک بھر میں حراستی اموات کے ۱۰۸ واقعات ہوئے جن میں ۳۰ صرف مغربی بنگال میں ہوئے۔ انسانی حقوق کی ایک دوسری تنظیم اے پی ڈی آر کے مطابق صرف اسی ایک سال میں مغربی بنگال میں ۲۶ حراستی اموات ہوئیں۔ ریاستی انسانی حقوق کمیشن کے صدر اور سابق جج چنتا توش مکھرجی کا کہنا ہے کہ ان واقعات سے ایسا لگتا ہے کہ انسانی زندگی کے وقار کے تئیں غیر حساسیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ابھی گذشتہ دنوں ۲۵ سالہ سبھاش داس کی پولیس حراست میں موت ہو گئی جس پر پولیس کے خلاف زبردست عوامی احتجاج ہوا۔ جس سے گھبرا کر حکومت نے حکم صادر کیا کہ حراستی اموات پر پولیس افسران کو وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا جائے اور پولیس تحویل میں اموات کے نتیجے میں گذشتہ تین مہینے میں چار پولیس جوانوں کو معطل کیا گیا۔ ریاستی داخلہ سکریٹری منیش گپتا ان اموات پر ایک دوسری ہی منطق پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ مغربی بنگال میں حراستی اموات کا ریکارڈ رکھنے میں کوئی بددیانتی نہیں کی جاتی اس لئے ایسا لگتا ہے کہ اس ریاست میں حراستی اموات زیادہ ہوتی ہیں۔

شاید وہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوسری ریاستوں میں بھی ایسی اموات ہوتی ہیں لیکن ان کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ حکومت دلیل دیتی ہے کہ تمام اموات کی ذمہ دار پولیس نہیں ہوتی۔ اس کے اعداد و شمار کے مطابق اس سال صرف ۱۳ افراد کی پولیس حراست میں موت ہوئی ہے اور ان میں سے تین نے خودکشی کی ہے۔ آٹھ کو پولیس کے حوالے کرنے سے قبل عوام نے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ حراست میں ان کی موت ہو گئی۔ صرف دو معاملات میں پولیس کی غیر ذمہ داری ثابت ہوتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت قصوروار پولیس والوں کو سزا دینے میں کوتاہی سے کام لیتی ہے۔ اس کی سب سے روشن مثال ۱۹۸۴ء میں ادریس میاں کی حراستی موت کا واقعہ ہے۔ اس کیس کی تفتیش ایس سی دیب کمیشن نے کی تھی۔ ادریس میاں پر الزام تھا کہ اس نے ایک پولیس افسر کا قتل کیا ہے۔ کمیشن نے ادریس میاں کی موت کی چھان بین میں سات پولیس جوانوں کو مورد الزام ٹھہرایا لیکن حکومت نے محکمہ جاتی تحقیقات کے نام پر ان پولیس والوں کے خلاف کارروائی کو لٹکا دیا۔ اور ابھی تک محکمہ جاتی انکوائری کی رپورٹ کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جن پولیس والوں کو عارضی طور پر معطل کیا گیا تھا۔ ان کو پھر بحال کر دیا گیا اور ان میں سے تین کی ترقی بھی ہو گئی ہے۔

حکومت عدالتی احکامات کی بھی خلاف ورزی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ء میں باگوہاٹی پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والے تین افراد کے اہل خانہ کو بیس بیس ہزار روپے دینے کا حکم عدالت نے دیا تھا لیکن حکومت نے ابھی تک معاوضہ نہیں دیا۔ اسی سال پولیس حراست میں سیلن گھوش کی بھی موت ہوئی تھی عدالت نے اس کے اہل خانہ کو بھی معاوضہ دینے کا حکم دیا تھا لیکن حکومت نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

پولیس ملزمین کو پکڑنے کے بعد انہیں رکھنے اور دوسرے معاملات میں انتہائی غیر ذمہ داری اور قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ انڈر ٹرائل ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد اس کی طبی جانچ ہونی چاہئے جو کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔

باقی ص ۸ پر

دیوبند میں زینت ناز کے الیکشن اور ان کی کامیابی کے معاملے میں

قومی اخبارات و رسائل کو اتنی دلچسپی کیوں؟

بات جب عالم اسلام کے معروف ادارے دارالعلوم کے قصبہ دیوبند کی ہو، جہاں ایک مسلم خاتون روایتی برقع لپیٹ کر رکھ دے اور بے حجاب ہو کر الیکشن لڑنے گلیوں میں نکل آئے اور جس کے مقابل ایک برقع پوش خاتون ہو اور پھر مسلم خواتین کے انتخابات میں حصہ لینے کے خلاف اس معروف ادارے سے فتوی صادر ہو جائے اور پھر دو دن کے بعد پردے میں اور شرعی حدود میں رہ کر مسلم خواتین کی الیکشن میں شرکت کو جائز قرار دے دیا جائے، اس کے باوجود بے برقع خاتون امیدوار زبردست اکثریت سے کامیاب ہوجائے تو یہ معاملہ یقینا عوام اور ہمارے ملک کے قومی اخبارات و رسائل اور قومی ذرائع ابلاغ کے لئے زبردست دلچسپی کا موضوع بن جاتا ہے۔

دیوبند کے میونسپل کارپوریشن کے چیرمین کے الیکشن میں محترمہ زینت ناز کی کامیابی اور الیکشن سے قبل اور اس کے بعد کی تمام تر سرگرمیوں میں قومی اخبارات کی خصوصی دلچسپی قابل دید ہے۔ اگر زینت ناز روایتی برقع میں رہ کر الیکشن لڑتیں اور کامیاب ہوتیں تو شاید ان کی دلچسپی کا موضوع نہیں بنتیں۔ اس سوال سے قطع نظر کہ نئی چیرپرسن کا سیاست میں آنے کے لئے چھ سال قبل برقع اتار کر رکھ دینے کا عمل کہاں تک درست ہے، یہ سوال اپنے آپ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ زینت ناز کا الیکشن انگریزی اور ہندی کے قومی اخبارات و رسائل کی دلچسپی کے لئے خاص موضوع کیوں بن گیا ہے

پہلے دیوبند، وہاں کے ماحول اور وہاں کی انتخابی سرگرمیوں کا سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دیوبند ایک مذہبی نوعیت کا اور دارالعلوم جیسی ممتاز اسلامی درسگاہ کا قصبہ ہے یہاں مسلم آبادی ۶۵ سے ۷۰ فیصد کے بیچ ہے۔ یہاں خواتین اپنا زیادہ تر وقت گھروں میں گزارتی ہیں اور بوقت ضرورت باہر نکلتی بھی ہیں تو روایتی برقع میں ملبوس ہو کر۔ بے حجاب خواتین خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ جس طرح دوسرے مسلم اکثریتی حلقوں کو حکومت نے یا تو خواتین کے لئے یا پھر دلتوں کے لئے ریزرو کردیا اسی طرح دیوبند کے میونسپل کارپوریشن کا حلقہ بھی خواتین کے لئے مخصوص کردیا گیا۔

سیاست میں آنے کے شوق نے زینت کو گھر سے باہر نکال دیا۔ زینت شروع سے ہی برقع میں رہتی آئی ہیں لیکن ۱۹۸۸ء میں کارپوریشن کے الیکشن میں جب برقع میں رہ کر چیرمین شپ کے لئے میدان میں اتریں تو بقول ان کے "ہماری زبردست ہار ہوئی۔" اس کے بعد ان کے اور ان کے شوہر کا ذہن بدلنے لگا۔ ان کے شوہر محمد ارشاد کے مطابق اس شکست سے ہمیں سبق ملا اور میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تم سیاست میں رہنا ہی چاہتی ہو تو برقع اتار دو۔ زینت کہتی ہیں کہ میں بہت پس و پیش میں تھی کیونکہ میں دیوبند ہی سے تعلق رکھتی ہوں اور یہاں کی فضا مختلف ہے۔ آخر یہاں کا ماحول مذہبی ہے۔ لیکن

> اس سوال سے قطع نظر کہ نئی چیرپرسن کا سیاست میں آنے کے لئے چھ سال قبل برقع اتار کر رکھ دینے کا عمل کہاں تک درست ہے، یہ سوال اپنے آپ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ زینت ناز کا الیکشن انگریزی اور ہندی کے قومی اخبارات و رسائل کی دلچسپی کے لئے خاص موضوع کیوں بن گیا ہے۔؟

زینت سے رہا نہیں گیا اور انہوں نے ۱۹۸۹ء میں یوم جمہوریہ کے موقع پر برقع لپیٹ کر رکھ دیا اور گھر سے باہر گلیوں میں نکل آئیں۔ ان کے اس قدم کی سخت مذمت ہوئی۔ ان کے والدین بھائی اور برادری والوں نے ان کا بائیکاٹ کردیا۔ خاندانی تقاریب میں ان کو مدعو کرنے کا سلسلہ بند ہو گیا اور ان کے بچے اسکولوں میں الگ تھلگ پڑ گئے۔ بقول ان کے ہم بالکل تنہا رہ گئے۔

لیکن زینت ناز نے اپنے قدم واپس نہیں لئے اور سماجی خدمات میں مصروف ہو گئیں۔ خواتین کی تنظیم بنائی اور حکام سے رابطہ بڑھایا۔ دریں اثنا حکومت نے اس حلقہ کو خواتین کے لئے مخصوص کردیا۔ اس پر سب نے بیک آواز کہا کہ "زینت کی لاٹری کھل گئی ہے۔" لیکن ابھی زینت کا راستہ صاف نہیں ہوا تھا۔ ۸ نومبر کو مسلم خواتین کی سیاست میں شرکت کے خلاف فتوی آگیا۔ زینت کا کہنا ہے کہ فتوے کے بعد ہر شخص کی نظر مجھ پر اٹھی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کوئی بہت بڑی گنہگار ہوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ اگر بے نظیر بھٹو، خالدہ ضیاء اور نجمہ ہپت اللہ نے گناہ کیا ہے تو میں بھی گناہ کروں گی۔ کچھ خواتین نے بھی انہیں دلاسا دی اور کہا کہ اگر ایک عورت کو ووٹ دینا گناہ ہے تو ہم یہ گناہ کریں گے چاہے بعد میں توبہ کرلیں۔ فتوی آنے کے بعد ان کی مقابل امیدوار حجن نغمہ قریشی نے اپنا پیپر اور پوسٹر لپیٹ کر رکھ دیا۔

> کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دوسرا فتوی حکمت عملی کے تحت دیا گیا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو غیر مسلم امیدوار کی کامیابی یقینی ہوجاتی۔ لیکن دارالعلوم کے ذرائع کے مطابق فتوی کسی سیاسی دباؤ کے تحت نہیں دیا گیا۔

دو دن بعد پھر دوسرا فتوی آیا جس میں شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ خواتین کی شرکت کو جائز قرار دیا گیا۔ اب حجن نغمہ کے شوہر نے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کے حق میں انتخابی مہم چلائی۔ نغمہ کا کہنا ہے کہ "انہیں" سیاست کا شوق ہے اس لئے میرا نام بھر دیا۔ کام انہیں کو کرنا ہے مجھے تو کرنا نہیں ہے۔ میں نے صرف ایک کام کیا کہ فارم پر دستخط کردیا۔ لیکن زینت نے اپنی انتخابی مہم بذات خود چلائی۔ میٹنگوں، جلسوں اور ریلیوں میں شرکت کی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دوسرا فتوی حکمت عملی کے تحت دیا گیا۔

کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو غیر مسلم امیدوار کی کامیابی یقینی ہوجاتی۔ لیکن دارالعلوم کے ذرائع کے مطابق فتوی کسی سیاسی دباؤ کے تحت نہیں دیا گیا۔ دوسرے فتوی پر دستخط کرنے والے مولانا حبیب الرحمن کا کہنا ہے کہ کسی نے سوال پوچھا اور ہم نے جواب دے دیا۔ لیکن اگر زیادہ سے زیادہ خواتین بے پردہ ہو کر معاشرے میں گھومیں گی تو اس کے غلط اثرات مرتب ہوں گے۔ بہتر یہی ہے کہ خواتین گھروں میں رہیں اور باہر کا کام مردوں کو کرنے دیں۔ دیوبند کے محمد سکندر کہتے ہیں کہ دیوبند میں فتووں کا زبردست اثر ہوتا ہے لیکن اس سلسلے میں دیا گیا پہلا فتوی سیاسی تھا۔ دوسرا سیاسی نہیں تھا لیکن اس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا کہ ہم زینت کے حق میں ووٹ دے دیں۔ کیونکہ بہرحال اس نے ایک اچھے مقصد کے تحت برقع ترک کیا ہے۔ زینت کے حمایتیوں کا کہنا ہے کہ وہ حجاب کے معاملے میں شرعی تقاضوں کی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہیں۔ صرف ان کا چہرہ اور ہاتھ کھلا رہتا ہے اور باقی پورا جسم چادر میں ڈھکا رہتا ہے۔

دارالعلوم کے بینک منیجر اور زینت کے سپورٹر نصیب صدیقی کا کہنا ہے کہ عوام پر فتووں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دراصل اب فضا بدل رہی ہے۔ سماجی اور سیاسی تبدیلی رونما ہو رہی ہے اسی لئے قوم نے زینت کے حق میں ووٹ دے کر اپنی پچھلی غلطی کا کفارہ ادا کردیا ہے۔ صدیقی کا کہنا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ مسلمان سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور شریعت کی عملی تشریح کریں۔ ان کے بقول اگر ہندوستان جیسے ملک میں شرعی تقاضوں پر ضدی رویہ اختیار کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔ وہ ریزرویشن کی مثال پیش کرتے ہیں کہ شریعت میں مسلمانوں کے درمیان امتیاز نہیں کیا جاتا لیکن اس صورت میں ہمیں ریزرویشن کا کوئی فائدہ نہیں ملے گا ہمارا نقصان ہی ہوگا۔ لیکن بہت سارے لوگ صدیقی کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ خواہ ہمارا فائدہ ہو یا نقصان ہمیں شرعی تقاضوں کی ہر حال میں پابندی کرنی چاہیے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ وقتی اور عارضی مفاد کے لئے ہم شرعی حدود کو بالائے طاق رکھ دیں اور غیر شرعی امور میں پھنس کر رہ جائیں۔ زینت کی زبردست کامیابی کے بعد بھی ایسا نہیں ہے کہ دیوبند کے مسلمانوں نے شرعی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اب بھی وہاں کے مسلمانوں کے وہی نظریات و خیالات ہیں جو پہلے تھے۔ زینت کے معاملے کو ایک استثنائی معاملہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ قومی اخبارات و رسائل چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ دیوبند کی فضا میں بے پناہ تبدیلی آرہی ہے۔ میڈیا یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ

رپورٹ: سہیل انجم

دیوبند کے اسلامی ادارے کا اثر مسلمانوں پر سے کم ہوتا جا رہا ہے۔

جہاں تک قومی اخبارات و رسائل کا اس معاملے میں دلچسپی لینے کا سوال ہے تو یہ لوگ جان بوجھ کر ایسے معاملات کو بانس پر چڑھاتے ہیں اور پھر اس کی آڑ میں مسلمان، اسلام اور شریعت میں کیڑے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزی کے نوزائیدہ ہفت روزہ "آؤٹ لوک" نے بھی زینت ناز پر ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔ رپورٹنگ کا انداز کتنا مسلم دشمن ہے اس کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ رپورٹ کا آغاز قرآن شریف کی ایک آیت کے ترجمے سے ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اور جب تم سوال کرو ان سے (ازواج مطہرات سے) کسی چیز کے بارے میں تو ان سے پردے کے پیچھے سے سوال کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے" اس ترجمے کے نیچے ہی زینت ناز کا بیان دیا ہوا ہے کہ "جمہوریت میں حجاب میں رہ کر سیاست نہیں کی جاسکتی"۔ اسی طرح دوسرے اخبارات و رسائل نے بھی مسلم دشمن رویہ اختیار کرتے ہوئے اس کی رپورٹنگ کی ہے۔ انگریزی اخبارات نے اس وقت سے ہی اس میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی جب زینت ناز نے پرچہ داخل کیا تھا۔ بعد میں مقدموں کی آمد اور زینت ناز کی کامیابی نے ان کی دلچسپی میں مزید اضافہ کردیا۔ اب یہ لوگ چیخ چیخ کر یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے دامن میں ایک نئی قیادت جنم لے رہی ہے جو پردے کی مخالف ہے اور جو آئندہ دیوبند کے ماحول اور وہاں کے لوگوں کے نظریات کو بدل کر رکھ دے گی۔

ہندستانی مسلح تنظیم کے ڈائرکٹر کا خفیہ دورۂ اسرائیل

حکومت دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے ایک دہشت گرد ملک کی مدد لے رہی ہے؟

نیشنل سیکورٹی گارڈس (این ایس جی) ہندوستان کی ایک مسلح تنظیم ہے جس کا مقصد دہشت گردانہ سرگرمیوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ حال ہی میں این ایس جی کے ڈائرکٹر جنرل اشوک ٹنڈن نے خفیہ طور سے اسرائیل کا دورہ کیا ہے، چونکہ سرکاری طور پر اس دورے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا اس لئے اس کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ پھر بھی بعض اخبارات نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرلیا ہے کہ اشوک ٹنڈن نے اکتوبر کے اواخر یا نومبر کے آغاز میں اسرائیل کا خفیہ دورہ کیا تھا۔ دورے کو خفیہ رکھنے کا مقصد غالباً عربوں کو اس ضمن میں بے خبر رکھنا تھا کیوں کہ یہ امکان موجود ہے کہ ان میں سے بعض ممالک اسے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں۔

اکتوبر کے اواخر یا نومبر کے آغاز میں ہی اشوک ٹنڈن نے جرمنی کا سرکاری دورہ کیا تھا جہاں انہوں نے جرمنی کی دہشت گردی مخالف سرکاری فورس جی ایس جی۔9 کے افسران سے تبادلہ خیال کیا۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ خفیہ طریقے سے تین دن کے لئے اسرائیل بھی ہو آئے۔ کیبنٹ سکریٹریٹ کے ایک افسر کے مطابق این ایس جی کی تنظیم اسرائیل اور جرمنی کی دہشت گردی مخالف فورسوں کے ماڈل کے مطابق کی گئی ہے۔ اس پس منظر میں اشوک ٹنڈن کا ان دونوں ممالک کا دورہ بالکل منطقی نظر آتا ہے۔

اپنے دورہ اسرائیل کے دوران اشوک ٹنڈن نے اسرائیلی دہشت گردی مخالف فورس "یامان" کے سینئر افسروں سے ملاقات کی۔ گفتگو کا محور مختلف میدانوں میں دو طرفہ تعاون تھا۔ وزارت داخلہ کے ایک افسر کے مطابق، جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے، ہندوستان دراصل اسرائیل سے اپنے کمانڈوز کی تربیت کو مزید بہتر بنانے میں مدد کے علاوہ بعض اہم سیکورٹی آلات اور ہتھیار بھی خریدنا چاہتا ہے۔ اسی افسر کے مطابق اشوک ٹنڈن کے دورے کا مقصد باہمی مفادات اور تعاون کے مختلف طریقوں اور امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ وزارت داخلہ کے ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آئندہ بھی ایسے دورے ممکن ہیں۔ جب بعض انگریزی روزناموں کے نمائندوں نے این ایس جی کے افسروں سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے یا وہ اس ضمن میں کیا کہنا چاہتے ہیں تو ان سے بار بار کی کوشش کے باوجود رابطہ قائم نہیں ہوسکا۔

اشوک ٹنڈن کا دورہ اس نوعیت کا پہلا دورہ نہیں تھا۔ ۱۹۸۴ء میں، جب این ایس جی کی بنیاد

> اسرائیلی خفیہ تنظیم موساد کے ایک سابق افسر نے حال ہی میں اپنی کتاب میں یہ انکشاف کیا ہے کہ کم از کم ۴۵ ہندوستانی کمانڈوز کو تربیت دی گئی تھی۔ ہندوستان اپنے کمانڈوز کو اسرائیلی سیکورٹی اکیڈمیوں میں بھیج کر چاہتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو مزید جلادیں۔

ڈالی گئی تھی اور جب ہند اور اسرائیل کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں تھے، ہندوستانی کمانڈوز کے ایک دستے نے اسرائیل کا دورہ کیا تھا۔ اسرائیلی خفیہ تنظیم موساد کے ایک سابق افسر نے حال ہی میں اپنی کتاب میں یہ انکشاف کیا ہے کہ کم از کم ۴۵ ہندوستانی کمانڈوز کو تربیت دی گئی تھی۔

اپنے حالیہ خفیہ دورہ اسرائیل کے دوران سمجھا جاتا ہے کہ اشوک ٹنڈن نے "یامان" کے تربیتی مراکز کا دورہ کیا۔ اس کے علاوہ "موساد" اور "شین بیت" کے افسروں سے مختلف سیکورٹی امور پر تبادلہ خیال کیا۔ باخبر ذرائع کے مطابق مسٹر ٹنڈن نے اسرائیل سے بعض مخصوص ہتھیاروں کی خریداری کے علاوہ، ان کی نگرانی کے نظام اور طریقے جاننے اور ویڈیو مانیٹرنگ کے سسٹم کو بھی سمجھنے میں دلچسپی ظاہر کی۔

اسرائیل سے تعاون کے ضمن میں وزارت داخلہ میں جو تجاویز زیر غور ہیں، اس میں اسرائیلی و ہندوستانی کمانڈوز کی مشترکہ تربیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح ہندوستان کو توقع ہے کہ اس کے کمانڈوز اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرسکیں گے اور دوسری کارآمد ترکیبیں بھی سیکھ سکیں گے۔ ہندوستان اپنے کمانڈوز کو اسرائیلی سیکورٹی اکیڈمیوں میں بھیج کر چاہتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو مزید جلادیں۔

گزشتہ اگست میں این ایس جی کے یوم تاسیس کے موقع پر منعقد کی گئی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیر داخلہ چوان نے کہا تھا کہ ہندوستانی کمانڈوز کو دوست ممالک کی دہشت گردی مخالف تنظیموں سے تعاون کرکے انتہائی جدید تکنیک حاصل کرنے کے علاوہ ان کے ساتھ مشترکہ تربیت کے لئے پروگرام بھی تیار کرنا چاہئے۔ وزیر داخلہ کے اس بیان کی تشریح کرتے ہوئے وزارت داخلہ کے افسران کہتے ہیں کہ سیکورٹی اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے معاملے میں ہندوستان اسرائیل سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ دراصل تیسری دنیا کے اکثر ممالک یہ یقین کرتے ہیں کہ فلسطینی گوریلاؤں کا مسلسل مقابلہ کرکے اسرائیل نے اس ضمن میں کافی مہارت حاصل کرلی ہے۔ ہندوستان کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ لیکن عربوں سے اپنی دوستی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے وہ کھلم کھلا اسرائیل سے تعاون کو قابل ترجیح نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس اسرائیلی برملا کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان سے ہر قسم کا تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ حالیہ دنوں میں ہندوستان اور اسرائیل کی دو طرفہ تجارت یا معاشی تعاون میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

کیا رابن کے قتل میں خود اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا ہاتھ ہے؟

شین بیت اسرائیل کی سرکاری خفیہ ایجنسی ہے جو اپنی کارکردگی کے لئے مشہور ہے۔ لیکن گزشتہ دنوں اسحاق رابن کے قتل کو روکنے میں ناکامی کے بعد یہ ایجنسی تنقیدوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ فلسطینیوں کے خلاف اور خود اپنے عوام کے خلاف جاسوسی میں ماہر اس تنظیم پر اسرائیل میں آج ہر طرف سے حملہ ہو رہا ہے۔

شین بیت براہ راست اسرائیلی وزیراعظم کو جواب دہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح سی بی آئی بھارتی وزیراعظم کی نگرانی میں کام کرتی ہے۔ مگر شین بیت خود اپنے سربراہ کی زندگی کی حفاظت نہ کرسکی۔ یہ سوال آج ہر اسرائیلی کر رہا ہے۔ ابھی شین بیت اس صدمے سے نکل نہیں پائی تھی کہ اسے دوسرے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ رابن کے قتل کے ضمن میں گرفتار کئے گئے مذہبی شدت پسند نوجوانوں میں سے ایک ایسا شخص بھی ہے جو شین بیت کا مخبر تھا۔ اس مخبر کو رابن کے قاتل یغال عامر پر بھی نظر رکھنی تھی۔ مگر اس نے کبھی بھی شین بیت کو یہ اطلاع نہ دی کہ عامر رابن کو قتل کرنے کی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ اسرائیلی سپریم کورٹ کے ایک ریٹائر جج کی قیادت میں ایک کمیشن رابن کے قتل میں شین بیت کی خامیوں کی تحقیق کر رہا ہے۔ ان سب باتوں سے شین بیت کا حوصلہ بالکل بکھر سا گیا ہے۔

۱۹ نومبر سے شین بیت کے کئی افسروں نے کمیشن کے سامنے اپنے بیانات دئے ہیں۔ اگرچہ

یہ بیانات خفیہ ہیں لیکن پریس نے اہم نکات پہلے ہی شائع کردئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شین بیت میں بے شمار ناکارہ اور فراڈ قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک چشم دید گواہ کا کہنا ہے کہ یغال عامر نے رابن کی سیکورٹی کو دھوکہ دے کر جس آسانی سے انہیں قتل کردیا وہ بہت اہم ہے۔ باخبر لوگ پہلے ہی سے کہہ رہے تھے کہ وہ شین بیت کے ایجنٹوں کی غفلت ہی نہیں بلکہ ان کے تعاون سے ہی ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ اب اسرائیلی اخبارات نے انکشاف کیا ہے کہ بلاشبہ شین بیت کے ایک غدار ہی نے عامر کی رابن کے قتل کے سلسلے میں مدد دی تھی۔ ۲۸ سالہ یویشائی ریویو، جو انتہاپسند مذہبی تنظیم ایال کا سربراہ ہے، وہ دراصل شین بیت کا تنخواہ یافتہ مخبر تھا جس کا کام مذہبی انتہاپسند یہودیوں کے خلاف جاسوسی کرنا تھا۔ ریویو کا کام یا طریقہ مذہبی انتہاپسندی کو بڑھاوا دینا تھا تاکہ وہ اس قسم کے لوگوں سے ربط قائم کرکے ان کے بارے میں شین بیت کو اطلاعات فراہم کرے۔ محض اطلاعات کی خاطر شین بیت نے اس شخص کو زہر افشانی کی اجازت دے رکھی تھی جو آج اسے مہنگی پڑ رہی ہے۔
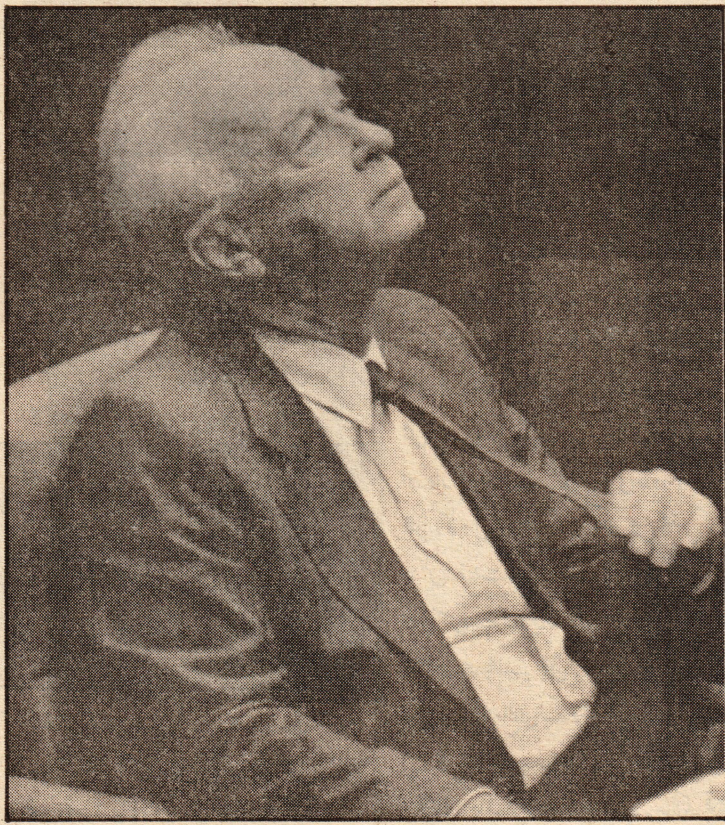
تحقیقی کمیشن کے سامنے شین

بیت کے ایک افسر نے یہ بیان دیا ہے کہ گزشتہ سال اگست میں ریویو سے کہا گیا تھا کہ وہ یغال عامر کے بارے میں اطلاعات فراہم کرے۔ ریویو نے اپنے باسوں کو بتایا کہ عامر عربوں کے قتل کے بارے میں گفتگو کرتا رہتا ہے۔ لیکن ان رپورٹوں میں کہیں بھی یہ تذکرہ نہیں تھا کہ وہ رابن کو بھی قتل کرنے کی دھمکی دیتا رہتا تھا۔ اس انکشاف کے اخبارات میں شائع ہونے کے بعد میڈیا میں رابن کے قتل کے پیچھے سازشوں کے بارے میں مسلسل قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔

دائیں بازو کی جماعتیں الزام لگا رہی ہیں کہ ریویو شین بیت کے کہنے پر مذہبی شدت پسندی اور رابن کے خلاف نفرت کے جذبات کو ہوا دے رہا تھا اس لئے کسی حد تک اس قتل کے لئے خود شین بیت قصوروار ہے۔ ایک دوسرا نظریہ سازش بھی گردش میں ہے جس کے مطابق شین بیت رابن کے قتل کا ایک جھوٹا ڈرامہ رچا کر ان کے مخالفین کو روشنی میں لانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے یغال کو ایک ریوالور دیا گیا جس میں نقلی گولیاں تھیں۔ لیکن کسی رابن مخالف ایجنٹ نے نقلی کی جگہ اصلی گولیاں ریوالور میں بھر دیں۔ اور اس طرح عامر رابن کے قتل میں کامیاب ہوگیا۔

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد کا کہنا ہے کہ خود شین بیت میں مذہبی شدت پسند یہودی موجود ہیں جنہوں نے رابن کے قتل کی سازش کو کامیابی سے نافذ کرنے میں بھرپور مدد دی۔ ان ساری باتوں کے پیش نظر لوگ امید کر رہے ہیں کہ تحقیقی کمیٹی کی رپورٹ کافی دھماکہ خیز ہوگی جو وزیراعظم شمعون پیریز کو مجبور کردے گی کہ شین بیت کی از سر نو تنظیم پر خصوصی توجہ دیں جو حکومت مخالف عناصر کے ساتھ ان فلسطینیوں کے خاتمے پر خاص توجہ دے گی جو اسرائیلی جارحیت کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ •

انتخابات میں حسنی مبارک کی کامیابی کے بعد

اخوان المسلمین پر سرکاری تشدد کی از سر نو یلغار

مصر میں گزشتہ نومبر کے انتخابات کے نتائج کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں تھا۔ تمام سیاسی مبصرین ایک بات پر متفق تھے کہ حسنی مبارک کی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی زور دھاندلی سے دو تہائی سیٹیں لازما جیتے گی۔ لیکن یہ سارے مبصرین حکمراں پارٹی کے حقیقی ارادوں کو بھانپنے میں ناکام رہے کیونکہ این ڈی پی نے زبردست انتخابی فراڈ کے ذریعہ ۹۴ فیصد سیٹیں "جیت" لیں یعنی ۴۴۴ رکنی اسمبلی کے کل ۴۱۶ ارکان حکمراں جماعت این ڈی پی کے ہیں۔ ۱۴ مختلف اپوزیشن جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور چودہ ہی آزاد ارکان ہیں۔ اخوان المسلمین جس کے انتخابی جلسوں میں بہت بھیڑ نظر آتی تھی اسے حکومت نے اسمبلی میں صرف ایک ممبر منتخب کرکے بھیجنے کی اجازت دی۔ فطری طور پر اپوزیشن جماعتیں اس زبردست دھاندلی کے خلاف آواز اٹھارہی ہیں۔ دوبارہ انتخاب کرائے جانے کے علاوہ وہ عدلیہ کا بھی سہارا لے رہی ہیں۔ حالانکہ مصری عدلیہ سیاسی اثرات و مداخلت سے کبھی بری نہیں رہی ہے۔

اخوان المسلمین مصر میں جمال عبدالناصر کے عہد سے معتوب ہے۔ مصری حکمرانوں نے اس اسلام پسند جماعت کے ارکان پر ہمیشہ طرح طرح کے مظالم ڈھائے ہیں۔ یہ سلسلہ مختلف انداز میں آج بھی جاری ہے۔

اخوان المسلمین عرصہ دراز سے غیر قانونی قرار دی گئی جماعت ہے۔ لیکن مختلف طریقوں سے یہ وہ سارے کام کرتی ہے جو ایک سیاسی جماعت سے متوقع ہوتا ہے۔ حالیہ انتخابات میں کسی دوسری جماعت کے ٹکٹ پر یا آزادانہ حیثیت میں اس کے ۱۳۰ ممبروں نے حصہ لیا تھا۔ لیکن انتخاب میں انفرادی طور سے یا کسی دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لینے کی آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اخوان اب حکومتی مظالم کا نشانہ نہیں ہیں۔ گزشتہ جنوری سے حکومت اخوان کو مختلف طریقوں سے پریشان اور خوفزدہ کررہی ہے۔ انتخاب سے قبل ہراساں کرنے کے بجائے حکومت مظالم پر اتر آئی۔ ۲۳ نومبر کو اخوان سے متعلق ۵۴ ڈاکٹروں، دانشوروں اور دوسرے ماہرین فن کو، جن میں سے اسمبلی کے امیدوار بھی تھے، ایک فوجی عدالت نے تین سے پانچ سال تک کی پرمشقت جیل کی سزا سنائی۔ اس کے فوراً بعد اخوان کا قاہرہ میں واقع مرکزی دفتر بند کردیا گیا اور بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔

> انتخاب سے ذرا قبل جن لوگوں کو جیل کی سزا سنائی گئی ان میں سے کوئی دہشت گرد نہیں تھا، بلکہ سب اعلی تعلیم یافتہ اور پرامن شہری ہیں جو خدمت خلق میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ بظاہر غیر قانونی قرار دی گئی اخوان سے وابستہ تھے۔

اگرچہ مصر میں ایسی "اسلامی جماعتیں" مثلاً الجہاد اور الجماعتہ الاسلامیہ موجود ہیں جنہوں نے حکومت کے خلاف چھوٹے پیمانے پر جنگ چھیڑ رکھی ہے، لیکن اخوان تشدد کی مذمت کرتی ہے۔ گزشتہ تین سال سے حکومت مخالف عناصر حسنی مبارک کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ گزشتہ جون میں عدیس ابابا میں مبارک پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور ۱۹ نومبر کو اسلام آباد میں واقع مصری سفارت خانے میں ایک بم دھماکہ سے ۱۶ افراد ہلاک ہوگئے تھے لیکن ان میں سے کسی میں بھی اخوان ملوث نہیں تھی۔ لیکن مبارک کی آمرانہ اور جابر حکومت نے اس کے باوجود اخوان کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ انتخاب سے ذرا قبل جن لوگوں کو جیل کی سزا سنائی گئی ان میں سے کوئی دہشت گرد نہیں تھا، بلکہ سب اعلی تعلیم یافتہ اور پرامن شہری ہیں جو خدمت خلق میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ بظاہر غیر قانونی قرار دی گئی اخوان سے وابستہ تھے۔

اخوان المسلمین مصر میں اسلامی نظام قائم کرکے موجودہ آمرانہ حکومت کا خاتمہ چاہتی ہے جو کرپٹ، غیر جمہوری اور مغرب کی غلام ہے۔ اخوان کا سماجی کام پورے مصر میں پھیلا ہوا ہے اور عوام اسے نظر تحسین سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ حکومت کو شبہ ہے کہ اعلی تعلیم یافتہ اخوان اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے کافی مقبول ہیں اور صاف ستھرے انتخاب میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں، اس لئے وہ انہیں طرح طرح سے ستاتی ہے۔ مبارک جیسے قاہر مصری وزیر داخلہ حسان الفی کا کہنا ہے کہ اخوان مسلح دہشت گردوں سے زیادہ "خطرناک" ہیں۔ الفی نے اس معنی میں سچی بات کہی ہے کہ پرامن سماجی کاموں اور اپنی ایمانداری، محنت اور لگن کے لئے مشہور اخوان بلاشبہ ایک کرپٹ، غیر جمہوری اور آمر حکومت کے لئے خطرہ ہیں۔ لیکن جو بات وہ بھول رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایسے "خطرات" مظالم کے ذریعہ ختم نہیں کئے جاسکتے۔

بلاشبہ مصر میں غلبہ اسلام میں تاخیر تو ہوسکتی ہے لیکن اب اسے روکنا الفی اور مبارک کے بس میں نہیں رہا۔ انتخابی دھاندلیاں عارضی اقتدار دلاسکتی ہیں، ایسے طریقوں سے عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کی جاسکتی۔ بہت جلد مصری عوام بیدار ہوکر مغرب پرست حکومت کا خاتمہ کرسکتے ہیں۔

●

"میں جلد ہی اقتدار کی باگ ڈور اپنے نائب کو سونپ دوں گا"

ملیشیا میں انور ابراہیم کی تاج پوشی عنقریب

طویل عرصے سے چل رہی قیاس آرائیوں کو ۶۹ سالہ مہاتر محمد نے اس وقت سچ کردکھایا جب وہ حکمراں جماعت کے ایک اجتماع سے خطاب کررہے تھے۔ ملیشیائی وزیراعظم نے کہا: "میں نے چودہ سال سے زائد عرصے تک پارٹی کی قیادت کی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اپنے وارث کو ایک ایسی پارٹی دوں جو مضبوط، معتمد اور متحد ہو" اگرچہ مہاتر نے یہ واضح نہیں کیا کہ وہ اقتدار اپنے نائب انور ابراہیم کو کب منتقل کریں گے لیکن انہوں نے کھلے انداز میں کہا کہ ایسا بہت جلد ہوگا۔

حکمراں جماعت کے سرکل میں بہت دنوں سے سرگوشیاں جاری تھیں کہ مہاتر محمد پارٹی پر اپنی گرفت کھوتے جارہے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں بہت جلد اقتدار سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ گزشتہ ستمبر میں پارٹی انتخابات کے دوران وزیراعظم کی حمایت یافتہ کئی امیدوار انور ابراہیم کے نامزد امیدواروں سے شکست کھاگئے تھے۔ اس کے بعد بہتوں نے برملا یہ کہنا شروع کردیا کہ بہت جلد، ممکن ہے آئندہ پارٹی کانفرنس میں، انور مہاتر کو اقتدار سے بے دخل کردیں گے۔ لیکن ایک حالیہ پارٹی کانفرنس میں ممبروں نے دونوں کو بالترتیب پارٹی کا صدر و نائب صدر

انور ابراہیم

برقرار رکھنے پر زور دیا۔ بہرحال کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مہاتر نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ بہت جلد اقتدار انور کو سونپ دیں گے۔

ستمبر ۱۹۹۵ء کے پارٹی برانچوں کے انتخاب میں اپنے بعض امیدواروں کی شکست کے بعد مہاتر نے کھل کر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔ ان کے کٹر حامی انہیں ورغلانے لگے تھے کہ انور وقت سے پہلے بوریا بستر باندھ کر انہیں رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں کی ایماء پر انہوں نے پارٹی کے عہدوں کے لئے انتخاب کے ضابطوں میں تبدیلی بھی کردی تاکہ آئندہ سال پارٹی صدر کے انتخاب میں انور ان کو چیلنج نہ دے سکیں۔

لیکن انور ایک ہوشیار سیاستداں ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھی صرف مہاتر کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ ان کے صبر کی بھی ایک انتہا ہے۔ یعنی وہ بہت دیر تک وزارت عظمی کے لئے انتظار نہیں کرسکتے۔ بہرحال اس سے عوام اور سماج کے سرکردہ افراد کو ایسا لگنے لگا تھا کہ ایک بے یقینی کا ماحول پیدا ہورہا ہے۔ جس کا ملک کی تیز رفتار معیشت پر اثر پڑے گا۔

اس بے یقینی کی کیفیت اور اس کے برے اثرات کا اندازہ کرکے حکمراں پارٹی کے سینئر ممبر حرکت میں آگئے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ انور
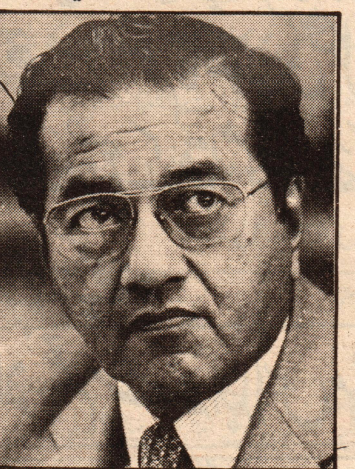
مہاتر محمد

کے اشارے پر حرکت میں آئے۔ سینئر ممبروں نے مرکز کو اس قسم کی تجویزیں بھیجنا شروع کردیں کہ وہ آئندہ سال پارٹی کانفرنس میں پارٹی صدر اور نائب صدر کا انتخاب نہیں چاہتے بلکہ موجودہ عہدیداروں یعنی مہاتر اور انور کو ہی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مہم میں پارٹی کی یوتھ ونگ کے صدر نظری عزیز کافی آگے تھے۔ واضح رہے عزیز انور سے کافی قریب ہیں۔

عزیز اور دوسرے سینئر لیڈروں کی کاوشیں بار آور ثابت ہوئیں۔ چنانچہ گزشتہ نومبر کی پارٹی اسمبلی میں ہر مقرر نے دونوں ہی اعلی لیڈروں کی خوب خوب تعریف کی۔ پارٹی کے سکریٹری جنرل نے کانفرنس کی تقریروں کا لہجہ یہ کہہ کر متعین کردیا کہ "ہم آپ دونوں سے محبت کرتے ہیں"۔ مقصد یہ تھا کہ ہم دونوں کے درمیان کسی قسم کا مقابلہ نہیں چاہتے۔ اسی موقع پر تقریر کرتے ہوئے انور نے مہاتر سے اپنی وفاداری کا اعادہ کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں "صدر کے تئیں میری وفاداری پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ کسی کو ہمیں

باقی ص ۱۶ پر

بوسنیا اور چیچنیا میں کامیاب مہم جوئی کے بعد اب ملی پارلیامنٹ نے ہندوستانی مسلمانوں کو پچاس سالہ سیاسی غلامی سے نجات دلانے کا فیصلہ کیا ہے

مابعد انہدام ہندوستان میں

جب مسلمانوں کا سیاسی مستقبل کفار و مشرکین کے ہاتھوں تار تار ہو چکا ہو
جب مشرک سیاسی پارٹیوں نے اسلام اور مسلمانوں کا تقدس پامال کر رکھا ہو
جب ہمارے بے بس علمائے کرام اور محترم ملی شخصیات کفار و مشرکین کی جوتیاں سیدھی کرنے پر مجبور ہوں
جب عام مسلمان حالات کی شدت سے تنگ آکر پوچھتا ہو کہ وہ اس سیاسی دنگل میں کیا کرے؟
اور جب یہ واضح طور پر محسوس ہونے لگے کہ خدا کے آخری رسول کی امت پر بے بسی کے شکنجے مزید سخت ہوتے جا رہے ہیں

تو ایک ایسی سنگین صورت حال میں امت کے غیور افراد پر لازم ہے کہ وہ سیاسی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں

الحمدللہ کہ

ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی صبح کی بشارت دینے کیلئے ملک بھر سے اراکین ملی پارلیامنٹ اور دردمندان امت کے قافلے پٹنہ پہنچ رہے ہیں جہاں

ملی پارلیامنٹ

۱۴/۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء

بمقام: شری کرشن میموریل ہال پٹنہ

کے پٹنہ اجلاس میں سیاسی بل کے مسودے پر بحث کے بعد اسے حتمی شکل دی جائے گی اور ان انقلابی اقدامات کا اعلان کیا جائے گا جن سے سیاسی غلامی کی زنجیریں کٹ سکیں

آپ کیا کریں؟

للہ آخری رسول کی امت کو کفار و مشرکین کے لئے نوالہ تر بننے سے بچایئے
اپنے علاقے میں دردمندان امت کے بڑے بڑے جلسے منعقد کیجئے اور پٹنہ اجلاس کے لئے سفارشات ترتیب دیجئے
تاریک راتوں میں اٹھ کر گریہ وزاری کیجئے کہ اللہ ہمارے دلوں پر ایک راستہ منکشف کر دے
ہر شہر اور گاؤں سے چھوٹے چھوٹے منظم قافلوں کی شکل میں پٹنہ اجلاس میں شرکت کیلئے تیاری کیجئے
اور اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کے لئے آپ سے جو کچھ بن پڑے ضرور کیجئے
اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو

ڈاکٹر راشد شاذ
قائد ملی پارلیامنٹ

مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کیجئے:

کمال اظفر ناظم پٹنہ اجلاس ہونس حمید پور کرجی، صداقت آشرم پٹنہ ۱۰

مرکزی دفتر: نیو سرسید نگر، علی گڑھ Tel/Fax: (0571)400182 | دہلی دفتر Fax: (011) 6926030 Tel: (011) 6827018

کیا بے نظیر حکومت چند دن کی مہمان ہے

الطاف حسین کے بھائی اور بھتیجے کے قتل کے بعد پاکستانی سیاست غیر یقینی صورتحال سے دوچار

۱۰ دسمبر کو ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین کے بھائی ناصر حسین اور ان کے بھتیجے عارف حسین کو قتل کردیا گیا۔ اس حادثے کے بعد وہی کچھ ہوا جو کراچی میں ایک عرصے سے ہوتا آرہا ہے ۔ الطاف حسین نے حکومت پر الزام لگایا کہ اس قتل کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے کیونکہ مذکورہ افراد کی موت پولیس حراست میں ہوئی۔ لیکن حکومت نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ قتل نامعلوم افراد نے کیا۔ اسی کے ساتھ حکومت نے عدالتی تحقیقات کی پیش کش بھی کردی۔ ظاہر ہے ایم کیو ایم حکومت کی اس تشریح سے مطمئن نہیں ہوئی۔ اور کراچی ایک بار پھر پے در پے ہڑتالوں کی زد میں آگیا۔ اسی کے ساتھ آگ اور خون کی ہولی پہلے کی طرح بغیر کسی رکاوٹ کے جاری ہے۔

دریں اثناء پاکستانی وزیراعظم نے سرکاری طور پر اپوزیشن لیڈر نواز شریف کو دعوت نامہ بھیجا ہے ۔ ان سطروں کی تحریر کے وقت نواز شریف کا ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ ان کے ایک ترجمان کا کہنا تھا کہ دعوت نامے پر پارٹی لیڈروں اور قانونی ماہرین سے گفتگو کے بعد فیصلہ کیا جائے گا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ نواز شریف دعوت نامے کو ٹھکرانے کے بجائے اسے مختلف شرطوں سے نتھی کرکے وزیراعظم کو گھیرنے کی کوشش کریں گے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مذاکرات سرے سے ہوں گے ہی نہیں ۔ واضح رہے کہ نواز شریف پہلے ہی بے نظیر سرکار گرانے کے لئے مظاہرے کر رہے ہیں۔

اسلامک یونیورسٹی جسے بے نظیر حکومت مسلم دہشت گردوں کا اڈہ بتاتی ہے

بے نظیر حکومت نے امریکہ کی خوشنودی کے لئے آج کل ایک تیسرا محاذ بھی کھول رکھا ہے یعنی مسلم بنیاد پرستوں کے خلاف ۔ چنانچہ بعض شدت پسند جماعتوں کے کارکن بڑے پیمانے پر گرفتار ہوئے ہیں اور دوسرے اسلام پسندوں کو تنگ کیا جارہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی ہے کہ بے نظیر حکومت میں وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے اسلام آباد میں واقع انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کو دہشت گردوں کا اڈہ قرار دے کر اس کے خلاف ایک ناپاک مہم چھیڑ رکھی ہے۔ گویا بے نظیر سردست اپوزیشن مسلم لیگ، ایم کیو ایم اور اسلام پسندوں سے بہ یک وقت برسرپیکار ہیں ۔ غالبا انہیں باتوں کے پیش نظر بعض مبصرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فوج، آئی ایس آئی اور امریکہ بے نظیر کے مخالف ہوگئے ہیں اور کسی بھی وقت ان کی حکومت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے ۔ بے نظیر خود بھی شاید ایسے ہی خطرات محسوس کر رہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ حکومت سے استعفی نہ دیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فوج اور دوسرے ادارے ان سے چھٹکارا چاہتے ہیں تو انہیں ان کی حکومت کو معطل کرنا پڑے گا۔ بے نظیر گویا چاہتی ہیں کہ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا انہیں سیاسی فائدہ پہنچنا چاہئے ۔ اپنی حکومت کی برطرفی کے بعد وہ عوام الناس میں اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کے باوجود انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گی کہ وہ مظلوم ہیں۔ سچ یہ ہے کہ بے نظیر امریکہ کو خوش کرنے کے علاوہ ہر محاذ پر بری طرح ناکام ہیں۔

نواز شریف اور ایم کیو ایم سربراہ الطاف حسین کے چہرے بھی داغدار ہیں۔ نواز شریف کے پاس پاکستان کے مسائل، خصوصاً کراچی کے الجھے کو ختم کرنے کے لئے کوئی پروگرام نہیں ہے۔ وہ خود بھی بے نظیر کی طرح محض اقتدار کے بھوکے ہیں اور ان کی ساری جدوجہد کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود اور بحالی امن سے زیادہ وزارت عظمیٰ کی کرسی پر قبضہ کرنا ہے۔

الطاف حسین کسی خاص سوجھ بوجھ کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں۔ وہ آج کل پاکستان کی ہر سیاسی جماعت اور ادارے سے مایوس ہیں اور اکثر اقوام متحدہ اور دوسری طاقتوں سے مداخلت اور مدد کی بات کرتے ہیں۔ آج کل وہ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ بھارتی مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔ گویا اب کراچی کا مسئلہ بھی بھارتی مسلمان حل کریں گے۔

پولیس اور ایم کیو ایم کے درمیان غیر انسانیت سوز جنگ چل رہی ہے وہ ہر اعتبار سے قابل مذمت ہے۔ غور سے دیکھیں تو اس جنگ میں حقوق انسانی کی پاسداری کے تعلق سے دونوں ہی پارٹیاں ظالم ہیں۔ ایم کیو ایم کے کارکنوں کو موقع ملتا ہے تو وہ اسی قسم کی بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں جو پولیس والوں کے ساتھ مخصوص ہے ۔ اب جو بات کھل کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ کراچی کے مسئلہ کو حل کرنا بے نظیر اور الطاف حسین جیسے بازیگروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ دونوں ہی کسی نہ کسی درجے میں مجرم ہیں اور مجرموں کا مقدر سزا ہونی چاہئے نہ کہ ان کے ہاتھوں ملک کی تقدیر دے دی جائے۔ اب موقع ہے جب عالم اسلام کو کراچی کے مسئلے پر آگے آنا چاہئے۔ بے نظیر، الطاف اور دوسرے متعلقہ سیاستداں ایک دوسرے کے بارے میں اس قدر بے اعتمادی رکھتے ہیں کہ کوئی تیسری پارٹی ہی انہیں مذاکرات کی میز پر لاکر جلتے ہوئے کراچی کو دوبارہ امن و آشتی کا شہر بنا سکتی ہے۔ شاید اسلامی کانفرنس کو اس وقت کراچی کے معاملے میں مثبت اور نتیجہ خیز مداخلت کے لئے خود کو آمادہ کرنا چاہئے۔

ایران تجارتی تقاضوں کے تحت ریشمی شاہراہ کو پھر آباد کرنا چاہتا ہے

> اس زبردست معاشی مارکیٹ کے ظہور کو بھانپ کر پاکستان کابل میں ایک ایسی حکومت کے قیام کا خواہاں ہے جو اسے افغانستان کے راستے سنٹرل ایشیا سے جوڑ سکے اور اس طرح آئندہ ہونے والے معاشی فوائد سے اسے بھی اس کا حصہ مل سکے۔

سارخ ایران ۔ ترکستان سرحد پر ایک قصباتی شہر ہے جو ازمنہ وسطی میں کافی مشہور تجارتی مرکز تھا کیونکہ مشہور زمانہ ریشمی شاہراہ، جو یوروپ سے لے کر چین تک کے تجارتی کاروانوں کی گزرگاہ تھی، یہاں سے ہوکر گزرتی تھی۔ جب سے ریشمی شاہراہ ، تجارت کے دوسرے راستوں کی دریافت کے بعد، بند ہوئی، اس وقت سے سارخ گمنامی کی تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے اس تاریخ شہر کی قسمت پھر جاگنے والی ہے۔ شمالی ایران میں واقع یہ چھوٹا سا شہر سردست ایرانی حکومت کی خاص توجہ کا مرکز ہے۔ نتیجتاً اس کی ترقی پر بے شمار رقم صرف کی جارہی ہے۔

سنٹرل ایشیائی مسلم ریاستوں کی روس سے آزادی کے بعد ہی سے ایران اس کوشش میں ہے کہ وہ پاکستان، افغانستان اور آزاد مسلم ریاستوں کے تعاون سے ایک معاشی و تجارتی بلاک قائم کرے ۔ پہلے ہی سے ایک Economic Co-operation Organization یعنی ای سی او قائم تھی جس کے ترکی، ایران اور پاکستان ممبر تھے۔ تین سال قبل ایران نے کوشش کرکے اس تنظیم کی ازسرنو تحریک دی اور افغانستان اور سنٹرل ایشیائی مسلم ریاستوں کو بھی اس کا ممبر بنالیا۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر بھی تہران میں واقع ہے۔

اپنی مذکورہ معاشی پالیسی کے نتیجے میں ایران پرانی ریشمی شاہراہ کو نئے انداز میں زندہ کرنا چاہتا ہے تاکہ یوروپ اور ایشیا کے مابین زمینی راستے سے ہونے والی تجارت میں اسے دوبارہ مرکزیت حاصل ہوجائے۔ اس وقت یہ تجارت بحرہند کے توسط سے ہندوستان اور چین کے راستے ہورہی ہے۔ پرانی ریشمی شاہراہ کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ایران مختلف پروجیکٹوں پر کام کررہا ہے۔ شمالی ایران میں کئی شہروں میں تہران کھلے تجارتی مراکز قائم کررہا ہے۔ سارخ بھی ایک ایسا ہی شہر ہے۔ سینکڑوں انجینئر اور مزدور سارخ سے قریب ریگستان میں ایک عظیم تجارتی مرکز کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔ قریب الختم سال یعنی ۱۹۹۵ء میں ایران نے دس لاکھ ٹن سے زیادہ ایرانی سامان سارخ کے راستے ترکمانستان اور قزاخستان بھیجا ہے ۔ ایرانی منصوبے کے مطابق سارخ کے قریب تجارتی مرکز مارچ ۱۹۹۶ء تک بن جائے گا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو تہران سارخ کے راستے سے کروڑوں ڈالر کی تجارت کرسکے گا۔

سارخ فری ٹریڈ کمپلیکس آستان قدس رضوی نامی ایک مذہبی تنظیم بنارہی ہے۔ یہ تنظیم اپنی معاشی و تعمیراتی صلاحیتوں کے علاوہ نتائج حاصل کرنے کے لئے بھی مشہور ہے۔ اس تنظیم کے مشورے پر صدر رفسنجانی نے اس علاقے کی معاشی زیارت کرنے والوں پر سے ویزا کی پابندی ہٹالی ہے۔ سارخ میں ایک انٹرنیشنل ایرپورٹ بھی قائم کیا جائے گا۔ مزید برآں اسے ریلوے لائن کے ذریعہ باقی ماندہ ملک سے بھی جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ مشہد سے سارخ تک ریلوے لائن بچھانے کا پروجیکٹ امید ہے آئندہ مارچ تک مکمل ہوجائے گا۔ بندر عباس سے بفق تک پہلے ہی ریلوے لائن موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورا ایران بہت جلد روسی ریلوے لائن سے جڑ جائے گا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خلیج فارس کی بندرگاہوں کا سامان بہ آسانی ریلوے لائن کے ذریعہ روس، سنٹرل ایشیا اور چین تک پہنچ سکتا ہے۔ ای سی او کے ممبر ہونے کے ناطے ترکی بھی ایک ریلوے لائن بچھا کر ایران سے جڑنے کی فکر میں ہے ۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر ایران براہ راست ریلوے لائن کے ذریعے یوروپ سے جڑ جائے گا۔ اس طرح پرانی تجارتی ریشمی شاہراہ ایک نئے ریلوے نیٹ ورک کے ذریعے دوبارہ زندہ ہوجائے گی جس میں ایران کو مرکزیت حاصل ہوگی۔ غالبا اسی زبردست معاشی مارکیٹ کے ظہور کو بھانپ کر پاکستان کابل میں ایک ایسی حکومت کے قیام کا خواہاں ہے جو اسے افغانستان کے راستے سنٹرل ایشیا سے جوڑ سکے اور اس طرح آئندہ ہونے والے معاشی فوائد سے اسے بھی اس کا حصہ مل سکے۔

سردست پاکستان سے لے کر روس تک بشمول ایران کے تمام ہی ممالک فنڈ کی کمی کے شکار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ تمام ہی ممالک

باقی ص ۱۵ پر

"ڈائنوں" اور "جادوگرنیوں" کے دیس میں

مافیا گروہوں نے سادہ لوح آدی باسیوں کو ٹونے ٹوٹکوں کی صلیب پر لٹکا دیا

اڑیسہ اور مغربی بنگال کی سرحد سے ملحق چھوٹا ناگپور ضلع کے سادہ لوح آدی باسیوں کی زندگی صدیوں سے جادو ٹونا کا چکر چلانے والے اوجھوں اور گنیوں کے طلسم کے سائے میں گزر رہی ہے۔ مافوق الفطری عناصر میں اعتقاد کی بناء پر ان آدی باسیوں کو آج بھی اپنی چھوٹی موٹی زمینوں یا جانوروں اور مویشیوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اجنبیوں سے خائف رہنے والے یہ لوگ اپنی ذہنی اور جسمانی صحت کی بقاء کے لئے بھی اوجھوں کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ جب اوجھا ان کی پریشانیوں اور بیماریوں کا علاج کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو اس کا رخ پلٹنے کے لئے اس کی ذمہ داری کسی ڈائن پر ڈال دیتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق کسی کے اندر سمائی رہتی ہے۔ ان آدی باسیوں میں جو نسبتاً ذہین اور باہوش ہوتے ہیں وہ گاؤں کے سردار یا فنڈا سے ساز باز کرکے اس مرد یا عورت کو آسیبی روح کا حامل قرار دے دیتے ہیں جس کی زمین یا ملکیت پر قبضہ کرنا انہیں مقصود ہوتا ہے اور جس کے بارے میں انہیں یقین ہو کہ وہ اپنی مدافعت نہ کرسکے گا۔

جائداد ہڑپ کرنے کے لالچ کے نتیجے میں صرف مفروضہ ڈائن کو ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کراندیتھ بلاک کے گیتادی کرشنا بوئی پال کے مطابق

یہ دونوں تصویریں اس کی ماں اور پھوپھی کی ہے جنہیں ڈائن کہہ کر مار دیا گیا۔

اس کی ماں کو ڈائن قرار دے کر جو ایک ضعیف شخص کی موت کا سبب بنی تھی لوگوں نے پورے گھر والوں کو ہلاک کر دیا۔

ایک بار کسی پر ڈائن ہونے کا ٹھپہ لگ جائے تو گاؤں کے بارسوخ لوگ اسے مع اہل وعیال کے یا تو مار ڈالتے ہیں یا گاؤں باہر کر دیتے ہیں اور اس کے مال و متاع کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ایک عورت چھٹنی مہتو جس کا تعلق سنگھ بھومی ضلع کے ایک آدی باسی گاؤں سے ہے نے رونگٹے کھڑا کر دینے والا تجربہ بیان کیا کہ ڈائن کے نام سے مشہور کرکے اسے گاؤں والوں نے ایک کمرے میں بند کرکے بعض اجنبیوں سے اس پر حملہ کروایا اور اس کے منہ میں غلاظت بھروائی۔

اسے اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ بے آس و بے سہارا گاؤں چھوڑنا پڑا۔ گاؤں سے نکال دئے جانے والوں کو کنویں سے نہ تو پانی لینے دیا جاتا ہے نہ انہیں اپنی فصل کاٹنے کی اجازت ملتی ہے چھٹنی اور اس کے گھر والے تو خوش قسمت ہیں کہ کسی طرح جان بچ گئی۔ اس سنگھ بھومی ضلع کے دیہاتوں میں اس سال بھوت پریت کے معاملہ میں ۲۱ افراد کی جانیں لی جا چکی ہیں۔

گیتادی گاؤں کے مذکورہ واقعہ میں اتفاق سے کرشنا کی ماں مرنے سے بال بال بچ گئی وہ کالے جادو اور توہم پرستی کے خلاف کمر کس کر اسی گاؤں میں ڈٹی رہی۔ گاؤں کے طاقت ور لوگوں نے اس کی زمین تو چھین ہی لی تھی وہ کچھ دور اس کے مضافات میں جاکر رہنے لگی اور وہاں دوسری زمین خرید لی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ڈائن ہونے کا الزام ایسی ہی عورتوں پر لگایا جاتا ہے جو خاندانی ورثے خصوصاً زمین جائداد کی برابر تقسیم کی بات کرتی ہیں اور اس کو مدعا بنا کر اپنے شوہروں سے الجھتی ہیں۔ یہ بات میجو سندی پر صادق آتی ہے جس کے شوہر کو اس کے گھر والوں نے خراب ترین زمین دی تھی۔ اس پر وہ اکثر واویلا مچاتی تھی۔ جب اس کے دیور کالڑ کا اچانک بیمار پڑ گیا تو اس کے سسرالیوں کو بدلہ لینے کا اچھا موقع ملا۔ انہوں نے مقامی اوجھا کو بلایا جس نے کھڑے کھڑے میجو سندی کو ڈائن قرار دے دیا۔ ۹ مہینے کی حاملہ اس عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ جان بچا کر جنگلی راستوں کی صعوبتیں برداشت کرتی کیتھولک راہباؤں کے ہوسٹل میں آکر پناہ لی۔ مگر یہاں بھی قسمت نے اس سے بے وفائی کی۔ ہوا یہ کہ قریب میں ایک کتا مر گیا اور اس کی آمد سے باخبر لوگوں نے میجو کو جانور کی موت کا ذمہ دار قرار دے کر اس کا پیچھا کیا۔ اس خوف سے کہ کہیں لوگ واقعی اس کی جان نہ لے لیں راہباؤں نے اسے چائباسا کے ڈپٹی کمشنر کے حوالے کر دیا۔ نیم شہری ماحول میں میجو بے دلی کے ساتھ رہتی ہے اپنے شوہر اور بچے سے دور جو گاؤں میں چھوٹ گئے ہیں اور نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ اس نے بھی انہیں وہاں جمے رہنے کی تاکید کی ہے ورنہ لٹھیت لوگ گھر اور زمین پر قابض ہو جائیں گے۔

ایک اور دلدوز واقعہ اس طرح ہے کہ نشے میں دھت لوگوں کے ایک گروہ نے ۱۸ سالہ اپاہج لڑکی چاند بندیا (فرضی نام) کی ماں پر اسے ڈائن کہہ کر حملہ کیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی وجہ سے پڑوسی کالڑ کا فوت ہو گیا۔ لاکھ دہائیوں کے باوجود اس کو نہیں بخشا گیا۔ چاند بندیا کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ بھائیوں اور بہنوں کو ہلاک کر دیا گیا اور پھر تین آدمیوں نے اسے ہوس کا نشانہ بنایا۔ اس کے دو بچے اس وجہ سے بچ گئے کہ وہ کسی عزیز کے یہاں دوسرے گاؤں میں گئے ہوئے تھے۔ اس نے چائباسا کے پی جی ویمنز ہوسٹل میں پناہ لی ہے جہاں ضلع انتظامیہ نے کھانا پکانے کے کام پر مامور کر دیا ہے لیکن نیم شہری ماحول بھی تعصبات سے خالی تو نہیں ہے یہاں بھی سرگوشیوں کے درمیان بعض لڑکیاں کہتی سنائی دیتی ہیں کہ چاند بندیا نے اپنی ماں سے کالا جادو سیکھا ہے اور اسی لئے زیادہ تر لڑکیاں اس سے کتراتی ہیں۔ سماجی سطح پر تعصب کی توثیق ڈائنوں کی تلاش میں رہنے والے موقع پرستوں کو دلیر بناتی ہے۔ کچائی بلاک پولیس نے پچھلے دنوں تیس افراد کو بھگونو گاؤں سے گرفتار کیا تھا جنہوں نے ایک خاندان کے چھ افراد کو اس الزام میں مار ڈالا تھا کہ اس کی بیوہ عورتیں کالے جادو کا عمل کرتی تھیں۔ چونکہ یہ قتل سماجی منظوری سے ہوئے تھے اس لئے گاؤں والوں میں سے کسی کے منہ سے بھی مجرمین کا نام نہیں نکلا۔

واقعہ یہ ہے کہ آدی باسیوں کے ذہنوں پر مافوق الفطری قوتوں میں اعتقاد کا غلبہ اتنا شدید ہے کہ خود اس کا نشانہ بننے والے آدی باسی بھی بھوت پریت وغیرہ کے تصور کو غیر حقیقی سمجھنے کی جرات نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر جیتو سورن بھی اس عقیدے سے انحراف نہیں کرتا جس کی بیوی کو ڈائن کی حیثیت سے مشہور گاؤں والوں نے سبرن رکھا ندی میں گردن سے پکڑ کر اس وقت تک ڈبوئے رکھا جب تک اس کا دم نہیں نکل گیا۔ سورن کے عقیدے سے پورے گروہ اور بستی کے عقیدے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آدی باسیوں کا یقین ہے کہ رات کو روحیں گاؤں سے باہر پیڑوں پر رہتی ہیں اور اماوس کی رات میں اپنے شکار کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ پرکھوں کی روحوں کو خاندان میں دوبارہ بسانے کی خاطر مخصوص رسوم انجام دی جاتی ہیں۔ نتیجتاً جادو اور ٹونے میں عقیدہ پشت در پشت چلتا جاتا ہے۔ مبینہ چڑیلوں کو اذیت دینے کے لئے نوجوانوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ دو ادھیڑ عمر کی بیواؤں کو کسی شیر خوار بچی کی موت کا سبب بننے کے الزام میں پندرہ سے بیس سال کے لڑکوں نے ہی ہلاک کیا تھا۔ بوکارو میں ملازم ان عورتوں کا عزیز نوجوان جس کا نام سوائی ہے اسے یقین نہیں آتا کہ اسی کی عمر کے لوگوں نے یہ حرکت کی ہوگی۔

خوش قسمتی (یا بد قسمتی) یہ ہے کہ ضلع پولیس نے قاتلوں کو سزا دینے کے بجائے عورتوں کے تحفظ کا نیا ایجنڈا ترتیب دیا ہے جس کی تاویل ردعمل کی پالیسی کے بجائے حفاظتی طریقہ کار اختیار کرنے میں دلچسپی سے کی جارہی ہے۔ اس سمت میں عوام کو بیدار کرنے کی غرض سے سنگھ بھومی کے تیرہ سو اسکولوں میں خصوصی مہم چلاکر ہندی اور مقامی زبان میں اشتہاروں اور اعلانوں کے ذریعہ توہم پرستی کے خاتمے کی کوشش ہورہی ہے۔ مغربی سنگھ بھومی کے ڈپٹی کمشنر نے انٹگریٹڈ چائلڈ ڈویلپمنٹ سنٹروں کو خصوصی پوسٹ کارڈ روانہ کئے ہیں تاکہ جہاں کہیں بھی ڈائن کی آڑ میں کسی عورت کو ستانے کی سازش کا پتہ چلے حکام کو اس کی اطلاع فوراً دی جائے۔

سنگھ بھومی کی مقامی معیشت میں ٹاٹا کمپنی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ تعلیم کا فقدان علاقے کے باشندوں کو توہم کا اسیر بنائے ہوئے ہے اس لئے کمپنی اپنے سماجی بیداری بجٹ میں اضافہ کرکے اس میدان میں تعمیری کام کرسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چھوٹا ناگپور کو بھوت پریت کے چنگل سے نکالنے کے لئے کئی دہائیوں کا عرصہ درکار ہوگا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اس وقت تک توہم کی لعنتوں سے نبرد آزما ہونے والے افراد کا ایک کارواں بھی بن چکا ہوگا۔ سردست اس سمت میں قانونی پیش رفت یہ ہے کہ اسی سرمائی اجلاس میں بہار اسمبلی میں اپنی نوعیت کا انوکھا بل پیش ہونے والا ہے جس کی رو سے کسی شخص کو ڈائن قرار دے کر اسے اذیت پہنچانا قابل تعزیر جرم شمار کیا جائے گا جس کی سزا چھ ماہ قید اور دو ہزار روپیہ نقد جرمانہ ہوسکتی ہے۔ اس قانون کی نظر میں جھاڑ پھونک اور ٹوٹکا بھی قابل تعزیر جرم قرار دئے جائیں گے۔ ابھی تک ہوتا یہ رہا ہے کہ مبینہ ڈائن کی موت کے بعد ہی قانونی کارروائی ہوتی تھی اور وہ بھی جو اس کی موت اجتماعی تشدد کے نتیجے میں ہوتی تھی اس لئے جرم کا ثبوت ملنا امر محال ہو جاتا تھا۔ ●

بقیہ: ——— مغربی بنگال

مغربی بنگال پولیس ریگولیشن ایکٹ کے مطابق ہر انڈر ٹرائل کو کم از کم ۳۶ مربع فٹ کے لاک اپ میں رکھا جانا چاہئے لیکن زیر حراست لوگوں کی بھیڑ سے ایسا نہیں ہو پاتا۔ ہر جیل میں ایسا نوٹس چسپاں ہونا چاہئے جس پر زیر حراست لوگوں کو رکھنے کے قواعد و ضوابط درج ہوں۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ حراستی موت کے واقعہ میں پولیس کو ۲۴ گھنٹے کے اندر اس کی اطلاع ریاستی انسانی حقوق کمیشن کو دینی چاہئے۔ اس کی جانچ عدالت کے ذریعہ ہونے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دینا چاہئے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ پولیس اپنی نگرانی میں جانچ کرواتی ہے جس سے جانبداری کا پہلو باقی رہتا ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی نہیں آپاتی۔

غرضیکہ ہر جگہ دھاندلی اور بدعنوانی کا دور دورہ ہے نہ تو پولیس محکمہ حراستی اموات کو کم کرنے پر غور کر رہا ہے اور نہ ہی ریاستی حکومت اس سلسلے میں سنجیدہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زیر حراست اموات کا سلسلہ دن بدن بڑھتا جارہا ہے اور مغربی بنگال کی پولیس بے نیام ہو کر بے قصوروں کی گردن کاٹ رہی ہے۔

اب بہار میں کوئی مسلمان مرد مکھیا نہیں ہو سکتا

بلدیہ اور گرام پنچایتوں کی حلقہ بندی میں مسلمانوں کے ساتھ زبردست زیادتی

پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں مسلم ممبران کی کم ہوتی ہوئی تعداد باعث تشویش تو تھی ہی اب گرام پنچایتوں اور بلدیاتی انتخابات میں بھی مسلمانوں کی تعداد کم ہوجائے گی۔ کیونکہ ریاستی حکومت نے ان انتخابات کو ریزرویشن کی بنیاد پر کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

بہار میں گرام پنچایتوں کا الیکشن ۱۸ برسوں کے بعد جنوری ۱۹۹۶ء میں ہونے جارہا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں نہ خوشی ہے اور نہ مسرت۔ بلکہ مسلمان اداس، مایوس اور پریشان نظر آرہے ہیں کیونکہ حلقہ بندی میں افسران نے تعصب سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی خالص بستیوں کو بھی تھوڑی تھوڑی ہندو آبادی، ہریجن آبادی سے ملاکر ایک پنچایتی حلقہ بنایا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی مسلم گرام پنچایت ہے جو کاٹ چھانٹ کی شکار نہ ہوئی ہو۔

اس کے علاوہ ریزرویشن کی دو دھاری تلوار نے مسلمانوں کے اکثریتی حلقوں کو بھی ان سے چھین لیا ہے۔ یا تو ان حلقوں کو ہریجنوں کے لئے ریزرو کردیا گیا ہے یا پسماندہ طبقات کے لئے یا پھر عورتوں کے لئے۔ جس سے ایسا لگنے لگا ہے کہ مسلمان مکھیاؤں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں اس نمائندہ نے چند اضلاع کا سروے کیا تو پایا کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ زیادتی پورے بہار میں ہوئی ہے۔

ضلع مشرقی چمپارن میں ایک بلاک ہے ڈھاکہ جہاں مسلمانوں کی تعداد برادران وطن کی تعداد کے برابر ہے۔ یہ بلاک ۲۳ پنچایتی حلقوں میں تقسیم ہے۔ جس میں سے تقریباً نصف پنچایتوں کے مکھیا مسلمان ہی ہیں۔ لیکن نئے ریزرویشن قانون کے مطابق اب اس بلاک میں صرف

اشفاق عالم نفیس کی رپورٹ

ایک ہی مسلمان مرد مکھیا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ۹ مسلم اکثریتی پنچایتوں کو ہریجن عورتوں اور عام عورتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اسی طرح ارریہ ضلع کے نرپت گنج بلاک میں ہوا ہے۔
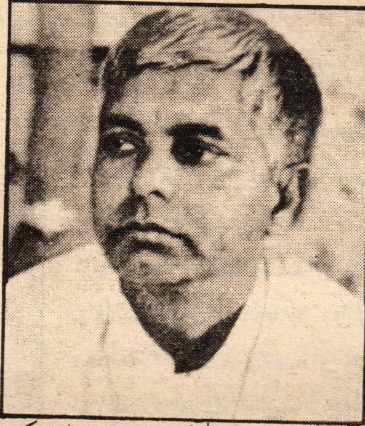
یہاں بھی دس مسلم اکثریتی پنچایتی حلقوں کو عورتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اب اس بلاک سے ایک بھی مرد مکھیا نہیں ہوسکتا۔ اسی ضلع میں پلاسی بلاک، ارریہ بلاک اور رانی گنج بلاک میں بھی یہی ہوا ہے۔ اور ان بلاکوں کی مسلم اکثریتی پنچایتوں کو عورتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ مدھوبنی ضلع کی مسلم اکثریتی پنچایتوں کا بھی ہے۔ مسلم اکثریتی پنچایتوں کے ساتھ یہ زیادتی پورے بہار میں ہوئی ہے۔ کچھ سیاسی لوگوں نے وزیراعلی بہار کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس سے مسلم عورتوں کے اندر بیداری آئے گی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلم عورتیں امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیں گی؟ دیہات کی عام عورتیں آج بھی ناخواندگی کے عمیق سمندر میں غرق ہیں تو کیا یہ عورتیں مکھیا جیسے اہم عہدہ کا حق ادا کرسکیں گی؟ کہیں ایسا تو نہیں یہ پالیسی مسلمانوں کو اعلی عہدہ پر پہنچنے سے روکنے کے لئے ابتدائی کوشش ہے۔ کیونکہ جب گاؤں کے مسلمان ابتدائی سیاست اور ترقی و فلاح کے کاموں میں حصہ نہ لے سکیں گے تو ان کے لئے مرکزی سیاست مشکل ہوگی۔ دوسری طرف مسلمان عورتیں امیدوار نہیں بنیں گی تو ہریجن عورتیں امیدوار بنیں گی۔ سرکار اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ مسلمان عورتیں امیدوار بنیں گی ہی نہیں اور مرد الیکشن لڑ ہی نہیں سکتے۔ ایسی حالت میں گاؤں کی ترقی و فلاح کا کام مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا جاسکتا ہے۔ اور اس سے بہتر مسلمانوں کو پیچھے کرنے کا کیا پتہ دوسرا موقع ملے نہ ملے۔

مذکورہ سرکاری پالیسی سے مسلمانوں میں غم و غصہ اور پریشانی و مایوسی کی لہر ہے۔ مگر سرکار سماجی انصاف کا کھوکھلا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو بے وقوف بنارہی ہے۔ اور مسلمان عورتوں کو بازار سیاست میں آنے پر مجبور و بے بس کرکے ان کے وقار و عظمت کو مجروح کرنا چاہتی ہے۔ ساتھ ہی اس سیاسی بازی گری سے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی پاکیزہ چادر کو تار تار کرنا چاہتی ہے اور یقیناً مسلمانوں کے ساتھ یہ ایک منظم سازش ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی مسیحا کہنے والی جنتا دل حکومت کا یہ کردار مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ دوسری طرف مسلمان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اور سرکار کی اس پالیسی کی مخالفت میں غم و غصہ تو رکھتے ہیں مگر کچھ کرنے کے لئے آگے نہیں آرہے ہیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس سازش کے خلاف آواز بلند کریں۔

بھاگلپور کے مجرموں کو سزا

دلانے میں لالو حکومت کو خاص دلچسپی نہیں

بہار کے وزیراعلی لالو پرشاد یادو نے گزشتہ جون میں اسمبلی اجلاس کے دوران بھاگل پور فساد سے متعلق انکوائری کمیشن کی رپورٹ ایوان میں پیش کرتے وقت وعدہ کیا تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر مجرموں کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ وہ اجلاس ختم ہوگیا دوسرا شروع ہوگیا اور اس درمیان سات مہینے کا وقفہ بھی گزر گیا لیکن مجرم تب بھی آزاد تھے اور اب بھی آزاد ہیں اور اندازہ ہے کہ آگے بھی آزاد رہیں گے۔ لالو حکومت نے اس سلسلے میں صرف ایک کارروائی کی تھی۔ انہوں نے اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس مسٹر جی پی دھورے کا تبادلہ کردیا تھا اور چند پولیس افسران کے خلاف وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا گیا تھا۔ وجہ بتاؤ نوٹس جاری کرنے کا مطلب کارروائی کا آغاز کرنا ہوتا ہے لیکن آغاز سے قبل نوٹس کا جواب بھی آنا ہوتا ہے۔ قارئین کو حیرت ہوگی کہ ابھی تک پولیس افسران نے وجہ بتاؤ نوٹس کا جواب تک نہیں دیا ہے اور نہ ہی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی سختی کی ہے۔ محکمہ داخلہ کے ذرائع کا کہنا ہے کہ مذکورہ افسران کو یاددہانی کے کاغذات ارسال کردئے گئے ہیں اور جلد ہی ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

حکومت کی جانب سے برتی جانے والی تساہلی سے فائدہ اٹھاکر ملوث افسران نے جن میں اس وقت کے ضلع مجسٹریٹ ارون جھا اور سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ایس پی دویدی بھی ہیں، حکومت کے نوٹس کے خلاف عدالت سے اسٹے لے لیا ہے۔ حکومت بھی شاید یہی چاہتی تھی اس لئے اس کی طرف سے ان افسران کو چھوٹ حاصل ہے۔ محکمہ داخلہ کے ذرائع کے مطابق حکومت ان افسران کے خلاف کارروائی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی البتہ عام انتخابات کے پیش نظر مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کے لئے علامتی یا ہلکی پھلکی کارروائی کرسکتی ہے تاکہ مسلمانوں میں لالو کی ساکھ بنی رہے اور مسلمان انہیں اپنا مسیحا سمجھتے رہیں۔ کچھ سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اگر لالو نے ان افسران کے خلاف کوئی کارروائی کی تو انہیں زبردست پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں انہیں فساد میں ملوث شرپسندوں کے خلاف بھی کارروائی کرنی ہوگی اور وہ ان کے خلاف کارروائی اس لئے نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان میں سے زیادہ تر ان ہی کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہرحال سابق کانگریسی حکومتیں تو مسلمانوں کو بے وقوف بناتی رہی ہیں لالو حکومت بھی ان کا استحصال کررہی ہے اور کمزوروں اور پسماندہ طبقات و اقلیتوں کی حکومت کا دعوی کرنے کے باوجود ان کے ساتھ انصاف نہیں کررہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملے میں سب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ثابت ہورہے ہیں۔

سمستی پور بیواؤں کی چیخ و پکار سے گونج رہا ہے

رپورٹ: کوثر بھگوت پوری

سمستی پور ضلع میں ایک اور بیوہ سونا دیوی کی چیخ و پکار کی گونج لوگوں کے کانوں تک پہنچی ہے۔ جس میں اس اونچی ذات کی خاتون نے ضلع انتظامیہ کے ذمہ داروں سے اپنی اور اپنی بیٹی کی جان بچانے کی دہائی دی ہے۔ سونا کے خاوند کی موت ۱۹۹۳ء کے اوائل میں ہوگئی۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ سونا دیوی اور بیٹی کو گھر کے افراد نے پریشان کرنا شروع کردیا تاکہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ بھاگنے پر مجبور ہوجائے اور اس کے شوہر کے حصے کی سترہ ایکڑ زمین بھائیوں کو مفت میں ہاتھ لگ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے سونا دیوی کے کردار پر کیچڑ اچھالنا شروع کردیا۔ جس سے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگئی۔ اس بیوہ نے ضلع انتظامیہ سے اپنی اور اپنی بیٹی کی جان کی حفاظت کی بھیک مانگتے ہوئے لکھا ہے کہ پچھلے دنوں اس کے گھر والوں نے اس کے حصے کی زمین پر جبراً قبضہ بھی کیا اور کھیتوں میں لگی تیار فصلیں بھی طاقت اور غنڈہ گردی کی بدولت کٹوالی۔

سونا دیوی نے تو ضلع انتظامیہ کے ذمہ دار افسروں کے نام پرچہ جاری کرکے اپنا دکھڑا رودیا ہے اور اپنی حفاظت کی بھیک مانگی ہے مگر کیا واقعی ضلع انتظامیہ اس بیوہ اور اس کی بیٹی کی حفاظت کرسکے گا۔ دراصل یہاں خواتین کے ساتھ مظالم کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس ضلع کی محمدہ گاؤں کی بیوہ عورت وینا دیوی کا حادثہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ عورت کو اس سماج میں جو درجہ قانونی طور پر حاصل ہے اس کی ایک سیڑھی بھی اسے چڑھنے دینے میں سماج کا زرپرست مافیا گروپ برداشت نہیں کرسکتا۔ وینا دیوی جب ۲۵ سال کی عمر کی تھی تو اس دوران اس کا شوہر چار بچوں کے ساتھ وینا کو چھوڑ کر چل بسا۔ شوہر کی موت کے بعد وینا دیوی اپنے گھر سے لگ بھگ دس کلومیٹر دوری سے روز پیدل جاکر سر پر تاڑی کا بھاری بوجھ اٹھاکر لاتی اور چھوٹی سی دوکان میں فروخت کرکے اس کی قلیل سی آمدنی سے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرتی لیکن لوگوں نے اسے بھی گوارا نہیں کیا اور پہلے تو اس کی آبرو سے کھیلنے کی کوشش کی اور بعد میں اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے۔ آخر اس بیوہ عورت پر ایک دن ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے گئے۔ اس کی عصمت کو داغدار قرار دیتے ہوئے اسے سماج کے بھیڑیوں نے برسرعام گاؤں کے چوراہے پر بے لباس کرکے اس کے عریاں جسم پر مظالم کا پہاڑ توڑا۔ سرعام سر کے بال کاٹ کر اس کا سماج میں تمسخر اڑایا گیا۔ اس گھناؤنی حرکت میں ضلع انتظامیہ کے افسران بھی ملوث نظر آئے اور کچھ مقامی سیاستداں بھی۔ اور ابھی تک نہ ہی وینا کو انصاف مل سکا ہے اور نہ ہی سونا کو۔

ایک خاتون پولیس ایک عورت سے تفصیل معلوم کرتے ہوئے

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ

ہندو احیا پسندی کا طوفان ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے

منوہر جوشی انتخابی مقدمے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر مختلف سیاسی پارٹیوں کا رد عمل متوقع لائن کے مطابق رہا ہے۔ بی جے پی نے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا ہے۔ مہاراشٹر کے وزیر اعلی نے اسے سچائی کی فتح قرار دیا جبکہ ایل کے ایڈوانی نے اسے ہندوتو اور ہندوازم سے متعلق بی جے پی کے نقطہ نظر کی تصدیق قرار دیا ہے۔ ان کے بقول ہندوتو دراصل کلچرل نیشنلزم یا ثقافتی قومیت ہے اور سپریم کورٹ نے اسی مفہوم کو صحیح قرار دیا ہے۔ گویا ان کے بقول سپریم کورٹ نے بی جے پی کے نظریہ ہندوتو کو جائز قرار دے دیا ہے۔

> سپریم کورٹ کے مطابق "ہندوتو ایک طریقہ حیات ہے یا ایک ذہنی کیفیت، اس لئے اسے مذہبی ہندو بنیاد پرستی کے مساوی نہیں مانا جاسکتا۔ اسی طرح لفظ ہندوتو کا مفہوم ہندو مذہبی تنگ ذہنی نہیں ہے۔

کانگریس کا رد عمل ہمیشہ کی طرح گومگو والا ہے۔ نہ تو کھل کر اس نے فیصلے کی تصدیق کی ہے اور نہ ہی اس کی مخالفت۔ اس کے برعکس جنتا دل کو اس فیصلے سے کافی مایوسی ہوئی ہے اور اس نے باقاعدہ مطالبہ کیا ہے کہ عوامی نمائندگی ایکٹ میں مناسب ترمیم کرکے اس کے ذریعہ سیاست میں مذہب کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔ سی پی ایم نے اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ غیر واضح ہے۔ خاص طور سے سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کے استعمال کے مسئلے پر تسلی بخش وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود کہ سپریم کورٹ نے مذہب کے غلط استعمال کی مذمت کی ہے پھر بھی اس فیصلے سے سی پی ایم کے مطابق سیاست میں مذہب کے استعمال کو فروغ ملے گا۔ اپنے بیان میں سی پی ایم نے یہ بھی یاد دلایا کہ ۱۹۹۴ء میں سپریم کورٹ کی دستوری بنچ نے دفعہ ۳۵۶ کی تشریح کرتے ہوئے فیصلہ دیا تھا کہ "سیکولرزم دستور کی بنیادی خصوصیت ہے اور مذہبی ریاست کے لئے اپیل ایک غیر دستوری سرگرمی ہے اس لئے غیر قانونی ہے۔" سی پی ایم کا کہنا ہے کہ مہاراشٹر میں ہندو ریاست کے قیام کا اعلان اسی زمرے میں آتا ہے۔

مختلف پارٹیوں کے رد عمل کو جاننے کے بعد آیئے دیکھیں کہ نفس مسئلہ ہے کیا؟ کچھ دنوں قبل مہاراشٹر ہائی کورٹ نے وہاں کے وزیر اعلی منوہر جوشی اور بعض دوسرے ارکان اسمبلی کے انتخابات اس بنیاد پر رد کردئے تھے کہ انہوں نے اپنی انتخابی مہم کے دوران مذہب کی بنیاد پر ووٹ مانگا تھا جو دستور کے مطابق غیر قانونی ہے۔ اپنی ایک تقریر میں منوہر جوشی نے اعلان کیا تھا کہ "مہاراشٹر میں پہلی ہندو ریاست قائم ہوگی۔" منوہر جوشی سے ہارنے والے کانگریسی امیدوار نے اسے بنیاد بنا کر ہائی کورٹ میں ان کے انتخاب کو چیلنج کیا تھا۔ منوہر جوشی ہی کے لئے بعض دوسرے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں کھل کر ہندوازم کی بنیاد پر ووٹ دینے کی اپیل کی تھی۔ لیکن ان تقریروں کے دوران منوہر جوشی اسٹیج پر نہیں تھے یا وہاں موجود نہیں تھے۔ اسی طرح بعض دوسرے ارکان اسمبلی نے بھی کھل کر ہندوتو کے نام پر ووٹ مانگا تھا۔ ان شواہد کی بنیاد پر ہائی کورٹ نے منوہر جوشی اور بعض دوسرے ارکان اسمبلی کے انتخابات رد کردئے تھے۔ ان تمام نے ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی تھی جس کے جواب میں حال ہی میں سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ فیصلے کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ منوہر جوشی کا یہ اعلان کہ "پہلی ہندو ریاست مہاراشٹر میں قائم ہوگی" سپریم کورٹ کے مطابق "ووٹروں سے ہندو مذہب کے نام پر اپیل کے مترادف نہیں ہے بلکہ ایسی کسی امید کا اظہار ہے۔" دیکھا جائے تو سپریم کورٹ الفاظ اور جملے کی ساخت میں الجھ کر رہ گئی اور اس نے کسی تقریر کے دوران ایسے الفاظ کے چھپے ہوئے مفہوم کو نظر انداز کردیا۔ دیکھنے کی بات یہ بھی تھی کہ ان الفاظ کو استعمال کرنے والا کون ہے، اس کا نظریہ اور مقصد زندگی کیا ہے۔ کیونکہ بعض جملوں کا مفہوم محض ان کی ساخت سے نہیں بلکہ بولنے والے کی مجموعی شخصیت اور اس کے نظریہ زندگی کے پس منظر میں سمجھا جانا چاہئے۔

اسی طرح سپریم کورٹ کا یہ ریمارک بھی محض قانونی موشگافی ہے کہ محض امیدوار یا اس کے ایجنٹ کے الفاظ ہی کی بنیاد پر اس کی گرفت کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی ہمدرد یا سپورٹر اسٹیج سے جس پر امیدوار یا اس کا ایجنٹ موجود نہیں ہے، مذہب کی بنیاد پر ووٹ مانگتا ہے تو اسے امیدوار کی غلطی مان کر اس کی قانونی گرفت نہیں کی جائے گی۔ کورٹ کا یہ ریمارک سیاست میں مذہب کے استعمال کو فروغ دے گا۔

۲۔ چونکہ بہت سے ارکان اسمبلی نے جن کا تعلق شیو سینا اور بی جے پی سے ہے، اپنی تقریروں میں بار بار ہندوازم اور ہندوتو کا استعمال کیا تھا جسے ان کے مخالفین دستور کے منافی تصور کرتے ہیں، اس لئے سپریم کورٹ نے ان الفاظ کی بھی تشریح کی ہے۔ سپریم کورٹ کے مطابق "ہندوتو ایک طریقہ حیات ہے یا ایک ذہنی کیفیت، اس لئے اسے مذہبی ہندو بنیاد پرستی کے مساوی نہیں مانا جاسکتا۔ اسی طرح لفظ ہندوتو کا مفہوم ہندو مذہبی تنگ ذہنی نہیں ہے اس لئے یہ دستور کے عوامی نمائندگی ایکٹ کی دفعہ ۱۲۳ کے سب سیکشن ۳ اور ۳ (الف) کے زمرے میں نہیں آتا۔"

واضح رہے کہ دفعہ ۱۲۳ کی مذکورہ دونوں شقیں کسی امیدوار کی امیدواریت کو مذہب کی بنیاد پر فروغ دینے یا مذہب کی بنیاد پر نفرت اور دشمنی پھیلانے سے متعلق ہیں۔ دیکھا جائے تو یہاں بھی سپریم کورٹ الفاظ اور جملے کی ساخت کے بارے میں زیادہ متفکر نظر آتی ہے۔ غالبا یہ سوچ کر کہ بعض ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوسکتے ہیں سپریم کورٹ نے مزید کہا "ان الفاظ (یعنی ہندوتو اور ہندوازم) کا غلط استعمال ان کے حقیقی مفہوم کو بدل نہیں دیتا۔

ان الفاظ سے پیدا ہونے والی خرابی کو روکا جانا چاہئے نہ کہ اس کے قابل اجازت استعمال کو۔" سپریم کورٹ کے مطابق یہ ایک قانونی مغالطہ ہوگا اگر کوئی ہندوتو اور ہندوازم کے استعمال کو غلط سمجھنے لگے۔ سپریم کورٹ کے بقول "ہندوتو اور ہندوازم کا محض نام لینے سے کوئی تقریر خود بخود مذہبی تقریر نہیں ہوجاتی یا یہ کہ کوئی ہندوتو کا استعمال کرکے ایسے کسی رویے کا اظہار نہیں کرتا جس کا مقصد دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے خلاف کوئی قابل نفرت قدم اٹھانا ہے۔ جو چیز دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ یہ لفظ کس طرح استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ ان لفظوں کے کسی تقریر میں استعمال سے کیا مفہوم اور تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ان کو اس طرح نہ استعمال کیا جائے جس کا صاف مطلب کسی ہندو امیدوار کے لئے اس کے مذہب کی بنیاد پر ووٹ مانگنا ہو یا اس بنیاد پر کسی غیر ہندو امیدوار کو ووٹ نہ دینے کی اپیل ہو، تب تک ان کا استعمال جائز ہے۔"

سپریم کورٹ کی مذکورہ تشریح سر آنکھوں پر۔ لیکن ہم کم فہموں کی سمجھ میں یہ بڑی مشکل سے آئے گا کہ شیو سینا اور بی جے پی کے لوگ ہندوتو اور ہندوازم کا استعمال کسی نیک نیتی سے کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ جماعتیں ایک ایسا ہندو راشٹر چاہتی ہیں جس میں اقلیتوں، خصوصا مسلمانوں کے لئے یا تو سرے سے کوئی جگہ ہی نہ ہوگی یا پھر انہیں قانونا نہیں تو عملا دوسرے درجے کا شہری بنا دیا جائے گا۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ جب ایڈوانی اور جوشی ہندوتو اور ہندوازم کا استعمال کرتے ہیں تو اس کا صاف مطلب جو سننے والے کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہی ہندو راشٹر کے چیمپئن ہیں اس لئے ہندوؤں کا ووٹ انہیں کو ملنا چاہئے۔ بد قسمتی سے سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان اس پہلو پر غور نہیں کرسکے۔

پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ کسی انتخابی جلسے میں مذہب کا ذکر ظاہر ہے اسی لئے ہوتا ہے کہ ووٹ اس کو ملنا چاہئے جو اس مذہب کا واقعی ہمدرد ہے۔ چونکہ بی جے پی اور شیو سینا اور ایسی دوسری تنظیموں نے خود کو اسی طرح پروجیکٹ کیا ہے کہ صرف وہی ہندوؤں کے ہمدرد اور ان کے مفادات کے نگہباں ہیں، جبکہ دوسری پارٹیاں اقلیت نوازی میں مصروف ہیں، اس لئے یہ لوگ جب بھی ہندوتو اور ہندوازم کا استعمال کرتے ہیں تو دراصل اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس مذہب کے ماننے والے انہیں کو ووٹ دیں۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو کسی انتخابی تقریر میں ان الفاظ کا استعمال ہی بے معنی ہوجاتا ہے۔ مگر سپریم کورٹ بد قسمتی سے لفظی گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فیصلے سے ہندو بنیاد پرستی اور ہندو احیاء پسندی کی بے انتہا ہمت افزائی ہوئی ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر شاید یہ مطالبہ بے جا نہ ہو کہ اس مسئلے کی مکمل توضیح کے لئے اسے سپریم کورٹ کی دستوری بنچ کے حوالے کردیا جائے۔ کیونکہ مسئلہ صرف ہندوتو اور ہندوازم کی تشریح اور ان کے استعمال کا نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ کیا سیاست میں، موجودہ ہندوستانی دستور کے مطابق، مذہب کا کھلے یا چھپے انداز میں استعمال جائز ہے یا نہیں؟

●

شیخاوت

قانونی کار

سپریم کورٹ نے اپنے اس متنازعہ فیصلے کے چند دن بعد جس میں "ہندوتو" کے استعمال پر مہاراشٹر کے وزیر اعلی منوہر جوشی کی کوئی گرفت نہ کرکے شیو سینا کے چیف بال ٹھاکرے کی منافرت پھیلانے والی تقریر پر ان کے خلاف فیصلہ دیا ہے، تقریبا اسی نوعیت کے ایک دوسرے مقدمہ میں راجستھان کے وزیر اعلی بھیروں سنگھ شیخاوت کے خلاف از سر نو سماعت کی ہدایت دی ہے۔ شیخاوت کے خلاف راجستھان ہائی کورٹ میں ان کے اسمبلی حلقہ پالی کے ایک ووٹر مسٹر موہن نے پٹیشن دائر کی تھی، جس میں انہوں نے شیخاوت پر الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے ۱۹۹۳ء کے اسمبلی انتخابات میں اپنی سولہ تقریروں میں مذہب کے نام پر ووٹ مانگا ہے جو کہ عوامی نمائندگی ایکٹ کے خلاف ہے لہذا ان کا انتخاب رد کیا جانا چاہئے۔ راجستھان ہائی کورٹ نے اس پٹیشن کو خارج کردیا تھا۔ لیکن اب سپریم کورٹ نے حکم دیا ہے کہ راجستھان ہائی کورٹ ہی میں اس کی از سر نو سماعت شروع کی جائے۔

اپنے فیصلے میں جسٹس جے ایس ورما، جسٹس این پی سنگھ اور جسٹس فیضان الدین کے بنچ نے کہا ہے کہ بابری مسجد انہدام کی لہر کے دوران وزیر اعلی نے مبینہ طور پر جو تقریریں کی ہیں اس سے بادی النظر میں انتخابی ضوابط کی خلاف ورزی ہوتی ہے لہذا ان کے خلاف از سر نو سماعت شروع کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس معاملے کو راجستھان ہائی کورٹ میں واپس بھیج رہے ہیں تاکہ اس پر دوبارہ غور کیا جاسکے۔

عدالت نے پٹیشنر مسٹر موہن کے ذریعہ پیش کی گئی شیخاوت کی سولہ تقریروں میں سے پندرہ کو خارج کرتے ہوئے سولہویں تقریر پر فیصلہ صادر کیا۔ یہ تقریر انہوں نے فالنا میں کی تھی۔ جس میں انہوں نے عوام سے بی جے پی کے حق میں ووٹ مانگتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ ووٹ نہ تو بھیروں سنگھ شیخاوت کے لئے ہے نہ کمل کے لئے۔ یہ ووٹ اس حقیقت کے لئے ہے کہ ہندوستانی عوام رام جنم بھومی پر اجودھیا میں

...وت کے خلاف ... کارروائی ہوگی؟

مندر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے آگے کہا کہ وزیراعظم کے مطابق وہ رام جنم بھومی پر مندر بنانا چاہتے ہیں اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے اگر آپ مندر چاہتے ہیں تو کمل کے ساتھ کھڑے ہوجائیے اور اگر آپ مسجد بنانا چاہتے ہیں تو جائیے کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلئے۔

پٹیشن میں کہا گیا ہے کہ وزیراعلی نے بی جے پی امیدوار کی حیثیت سے مذہب کی بنیاد پر دو فرقوں میں منافرت کے جذبات بھڑکائے جس کی بنا پر کانگریس امیدوار کو شکست ہوئی۔ وزیراعلی نے کئی جلسوں میں رام کے نام پر ووٹ مانگا اور اجودھیا کی متنازعہ عمارت کا حوالہ بھی دیا۔ انہوں نے عوام سے کہا کہ وہ مذہبی علامت کمل پر مہر لگائیں کیوں کہ ووٹنگ ایک ہندو تہوار "دھن تیرس" کے دن پڑرہی ہے اور کمل پر اس لئے مہر لگائیں کہ "ماتا سرسوتی کمل سے پیدا ہوئی ہیں۔"

شیخاوت کے وکیل کے کے وینو گوپال نے اپنی جواب دہی میں کہا کہ اگر وزیراعلی کی تقریر پر دورائیں ہوں تو اس معاملے کی ازسرنو سماعت کی جانی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ فالنا کی تقریر پر دوبارہ سماعت ہوسکتی ہے لیکن بقیہ پندرہ تقریروں سے متعلق راجستھان ہائی کورٹ پہلے ہی فیصلہ کرچکا ہے، انہوں نے آگے کہا کہ پٹیشنر کے الزامات کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی جب انہوں نے وزیراعلی کے خلاف کوئی مخصوص الزام نہیں لگایا ہے، ان کے مطابق راجستھان ہائی کورٹ نے بقیہ پندرہ تقریروں سے متعلق جو فیصلہ دیا ہے اس کو الٹا نہیں کیا جانا چاہئے۔ ہائی کورٹ نے مئی ۱۹۹۴ء میں موہن کی پٹیشن خارج کی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخاوت نے اپنی تقریروں میں انتہائی جارحانہ رخ اختیار کیا تھا اور مسلمانوں کے خلاف کھل کر زہرافشانی کی تھی۔ انہوں نے رائے دہندگان سے کہا تھا کہ اگر وہ مندر کی تعمیر چاہتے ہیں تو بی جے پی کو ووٹ دیں اور اگر اجودھیا میں کوئی مسجد بنتی ہے تو اسے تباہ کردیں اسے توڑ دیں۔ ان کی تقریروں سے فرقہ وارانہ منافرت میں اضافہ ہوا اور ہندوؤں کی اکثریت نے جو کہ اس وقت رام مندر کے بخار میں مبتلا تھی شیخاوت کے حق میں ووٹ دیا۔ شیخاوت کے خلاف اس کیس کی تیزی سے سماعت ہونی چاہئے اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے جرم میں ان کے الیکشن کو خارج کردیا جانا چاہئے۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف منوہر جوشی، بال ٹھاکرے، پربھو اور شیخاوت نے ہی اشتعال انگیز اور منافرت پھیلانے والی انتخابی تقریریں کیں۔

بی جے پی اور شیو سینا کے ایسے بے شمار لیڈران ہیں جنھوں نے مذہب کا سہارا لیا اور مسلم دشمنی کا بیج بوکر ہندوؤں سے ووٹ کی اپیل کی۔ ان سبھی کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ سپریم کورٹ کی نیت پر شک نہیں کیا جانا چاہئے لیکن منوہر جوشی کے سلسلے میں اس نے جو فیصلہ دیا ہے اس سے سیکولر اور انصاف پسند عوام کو دھچکہ لگا ہے۔ عدالت نے بال ٹھاکرے کے خلاف جو فیصلہ دیا ہے اس کی رو سے وہ چھ سال تک الیکشن نہیں لڑسکتے۔ عدالت کو صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی سفارش کرنی چاہئے تھی کہ ٹھاکرے کے خلاف مقدمہ چلایا جائے اور انہیں سزا دلانے کے عمل کا آغاز کیا جائے۔ ٹھاکرے کے ساتھ ساتھ اوما بھارتی اور رتھمبرا جیسی شعلہ بار سادھویاں بھی ہیں جو محض مسلم دشمنی کا انجکشن لگاکر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ورغلاتی ہیں۔ پچھلے الیکشن میں ان کی زہریلی تقریروں سے بھی ماحول بہت خراب ہوا تھا اور بی جے پی کو انتخابی فائدہ پہنچا تھا۔ لہذا عدالت کو چاہئے کہ ان لوگوں کے خلاف بھی فیصلہ دے۔ اگر عدالت اپنے طور پر کچھ نہیں کرسکتی تو کچھ سیکولر افراد کو سامنے آکر یہ معاملہ عدالت کے زیر غور کرنا چاہئے تاکہ آئندہ فرقہ واریت کی بنیاد پر کوئی بھی لیڈر نہ تو ووٹ مانگ سکے اور نہ ہی عوام میں منافرت پھیلاکر اپنا الوسیدھا کرسکے۔ •

اب بعض سیاسی پارٹیاں مذہب کا واسطہ دیں گی اور

عدالتی فیصلے سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی

معروف قانون داں سولی سوراب جی کا نقطہ نظر

شیو سینا۔ بی جے پی اتحاد کے امیدواروں کی الیکشن اپیلوں پر سپریم کورٹ کے فیصلے دوررس اہمیت کے حامل ہیں۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ کیا "فلاں امیدوار" اپنی انتخابی مہم کے دوران مذہب کے نام پر ووٹ مانگ کر عوامی نمائندگی قانونی مجریہ ۱۹۵۱ء کی دفعہ ۱۲۳ (۳) کے تحت بدعنوانی کا مرتکب ہوا تھا۔ عدالت نے اس بحث کو بھی مسترد کردیا کہ مذہب کا واسطہ براہ راست طور پر دیا جانا ضروری ہے مثال کے طور پر کہ "الف" کو ووٹ دیجئے کیونکہ وہ ہندو ہے یا "ب" کو ووٹ نہ دیجئے کیونکہ وہ مسلمان یا عیسائی ہے۔ عدالت نے یہ موقف اختیار کیا کہ کسی شخص کی تقریر کا مواد اور جس انداز میں سننے والے اسے سمجھتے ہیں اس کی نوعیت کا تعین کریں گے نا کہ زبان کے فنکارانہ استعمال کی آڑ میں کہی گئی بات۔ اسی طرح عدالت نے اس دعوے کو بھی تسلیم نہیں کیا کہ ایسی تقریر جس میں کسی مذہب کا واسطہ دیا گیا ہو ممنوع ہوگی بقول اس کے ایسی تقریر اس وقت تک ممنوع نہیں ہوگی جب تک کہ وہ متعصبانہ طور پر عوامی نظم و ضبط کو متاثر نہ کرے کیونکہ اس دفعہ کا زیریں مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ کسی امیدوار کا مذہب اس کے لئے سیاسی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہ بن جائے۔ تاہم عدالت نے اس کی وضاحت کردی کہ انتخابی تقریر میں مذہب کا ذکر متوقع نہیں ہے۔ جمہوری وضع کی تقریر میں جس میں کسی مخصوص مذہب کے خلاف امتیاز رکھنے کا الزام لگایا جائے اور عدم توازن کو دور کرنے کا وعدہ کیا جائے اسے مذہب کی بنیاد پر اپیل کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بالفاظ دیگر مذہب کوئی گندہ لفظ نہیں ہے اور نہ ہی انتخابی مہموں کے دوران محض اس کا حوالہ دینا ہی معیوب ہے۔ فیصلے کا یہ حصہ ناقابل استثناء ہے۔

دفعہ ۱۲۳ (۳) کو اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا تھا کہ ۱۹ (۱) (الف) میں دی گئی آزادی تقریر کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ دلیل یہ تھی جیسا کہ عدالت کا خیال ہے کہ اگر ممنوع انتخابی تقریروں میں جن میں مذہب کا واسطہ دیا جاتا اگرچہ ان میں عوامی نظم و ضبط کے خلاف کسی تعصب کا کوئی عنصر ہوتا ہے اور ان سے کوئی تشدد بھڑکتا ہے تو اس پر لگائی گئی پابندی دفعہ ۱۹ (۲) میں مذکور متعینہ مدوں سے خارج ہے جس کے تحت ریاست کے امن و امان، باہری ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات، عوامی نظم و ضبط، شائستگی یا معقولیت، نیک چلن، توہین عدالت، ہتک عزت یا تشدد بھڑکانا جیسے معاملات آتے ہیں۔ عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ پابندی، شائستگی کی مد میں شمار ہوتی ہے جو محض جنسی معاملات تک محدود نہیں ہے جیسا کہ مدھیہ پردیش کے ہائی کورٹ اور جموں و کشمیر کے چہار ججی بنچ کے دو ججوں نے دفعہ ۱۹ (۲) میں اخلاقیات کو جنسی اخلاقیات تک محدود نہیں رکھا ہے۔ انتخابی تقریروں میں مستعمل ہندوتو اور ہندوازم کے الفاظ اور ان کے اثرات کا تعین بھی عدالت کے نزدیک پیچیدہ مسئلہ تھا اور گزشتہ فیصلوں کی روشنی میں اس نتیجہ

پر پہنچا گیا کہ ان الفاظ کو کوئی معینہ مفہوم نہیں دیا جاسکتا اور ان کو تنگ نظر بنیاد پرستی کے مساوی بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ عام مفہوم میں ہندوتو ایک ذہنی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح محض ہندوتو اور ہندوازم کا لفظ زبان سے ادا کرنے پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ان الفاظ سے کیا کام لیا جارہا ہے اور تقریر میں ان الفاظ سے کیا معنی مرتب ہورہے ہیں اس سے تعین ہوگا اس بات کا کہ آیا کوئی مخصوص تقریر امتناعی دائرہ کار میں آتی ہے یا نہیں۔

نظریاتی سطح پر عدالت کا موقف حق بجانب ہے۔ لیکن جس نکتہ سے صرف نظر کیا گیا ہے وہ یہ کہ اگرچہ عدالت نے محض ان الفاظ کے استعمال کو قابل گرفت نہیں گردانا ہے جن کے معنی معین نہیں ہیں۔ اقلیتی فرقے خصوصا مسلمان سے عداوت رکھنے والے انتخابی امیدوار جب ان کا استعمال کرتے ہیں تو ان میں یقینا مذہبی یا مذہب مخالف رنگ آجاتا ہے۔ اس ضمن میں عدالت نے اپنے سابقہ نکتے کو نظرانداز کردیا کہ انتخابی مہم میں تقریروں کے مخاطب عام لوگ ہوتے ہیں اور یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ عوام ان تقریروں سے کیا مفہوم اخذ کرسکتے ہیں۔ یہ خیال حقیقت فراموشی کے مترادف ہوگا کہ جن لوگوں نے شیو سینا۔ بی جے پی کے امیدواروں سے ہندوتو کو فروغ دینے کے بارے میں سنا ہوگا اس سے وہ ہندوستانیوں کا طرز زندگی مراد لیں گے۔

یہ درست ہے کہ عدالت نے ہندوتو کے بے جا استعمال کے خلاف متنبہ کیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا فیصلہ انتخابی امیدواروں کو مذہب کا واسطہ دینے کی کھلی چھوٹ نہیں دیتا۔ یہ بھی غلط نہیں کہ سوریہ کانت مہادک کے معاملے میں کورٹ کا یہ موقف کہ ہندوتو کے تحفظ کے لئے شیو سینا کو ووٹ دینے کے لئے ان کی اپیل بدعنوانی میں شمار کی جائے گی۔ فکرمندی کی بات یہ ہے کہ عدالت کے خیالات و مشاہدات کو بعض سیاسی پارٹیاں امتناعی قانون سے دامن بچاکر آرائشی الفاظ میں انتخابی تقریروں کے درمیان ہندوتو کے مفاد کو فروغ دینے کی خاطر مذہب کا واسطہ دے کر اس سے سیاسی فائدے حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔

مہاراشٹر کے وزیراعلی منوہر جوشی کے معاملے میں عدالت نے بجاطور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انتخابی تقریر کے ضمن میں ان کے خلاف کوئی بدعنوانی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن عدالت کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ جوشی کا یہ بیان کہ پہلی ہندو ریاست مہاراشٹر میں قائم ہوگی۔ بذات خود مذہبی بنیاد پر ووٹ کی اپیل نہیں ہے بلکہ یہ طرز بیان اور زیادہ سے زیادہ ایک توقع کی نشاندہی کرتا ہے۔ یقینا کوئی شخص ایسی توقعات کا اظہار نہیں کرسکتا جو جمہوریت مخالف ہوں۔ فرض کیجئے کہ یہ امید ظاہر کی جاتی کہ مستقبل میں ہندوستان میں صرف ایسے ہی لوگوں کی آبادی ہوگی جو صرف ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ یا فرض کیجئے کہ کوئی مذہبی تبلیغی ادارہ یہ امید ظاہر کرے کہ آئندہ دہائی میں ہندوستان کی پوری آبادی عیسائی یا مسلمان ہوجائے گی۔ اس طرح کے بیانات قوی تر مذہبی لہجہ رکھتے ہیں اور جمہوریت شکن ہیں۔ عدالت کو چاہئے تھا کہ ایسے بیانات کو نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ بدعنوانی کے مترادف قرار دیتی۔ یہ المیہ ہے کہ ایسا ناپسندیدہ شخص مہاراشٹر حکومت کا سربراہ بنا ہوا ہے۔

عدالت کی طرف سے بال ٹھاکرے کی تقریروں کی مذمت یقینا حوصلہ افزا ہے جس میں بے لگام زبان کے استعمال اور ایک مخصوص گروہ کے خلاف نازیبا الفاظ کے استعمال پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے اور عدالت نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس طرح کی غضب انگیز تقریریں ہمارے عظیم تہذیبی ورثے کی روح کو مجروح کرتی اور جمہوری اقدار کے زوال کے درپے ہیں۔ (تلخیص)

اس شمارے کی قیمت پانچ روپے
سالانہ چندہ ایک سو روپے / چالیس امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپواکر
دفتر ملی ٹائمز انٹر نیشنل
49، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا
فون نمبر 6827018 ۔ 6926030
سری نگر بذریعہ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ روپے

اگر ہم نے الگ سیاسی پلیٹ فارم بنایا ــــــــ تو

ہم سیاسی اچھوت بنا دیئے جائیں گے

نوٹ

آئندہ عام انتخاب کے پیش نظر مسلمانوں میں زبردست شش و پنج کی کیفیت ہے وہ سردست یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کس سیاسی جماعت کے حق میں اپنا ووٹ دیں۔ اس صورت حال میں ہماری کوشش ہے کہ سنجیدہ بحث کے اس کالم میں ایسی باتیں ابھر کر سامنے آئیں جو مسلمانوں کے لئے مشعل راہ نہ سہی کم از کم کسی قسم کی حکمت عملی اختیار کرنے میں ضرور معاون و مددگار ثابت ہوں۔ اہل فکر اور صاحب الرائے حضرات کے خیالات و نظریات کو نمایاں انداز میں شائع کیا جائے گا (ایڈیٹر)

تحریر: شبث محمد اسماعیل اعظمی (جامعہ ہمدرد)

آنے والے پارلیمانی انتخابات میں مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہو؟ اور وہ کیا فیصلہ کریں؟ بڑا نازک سوال ہے، اگر مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنی ہو تو اس کا جواب ایسے الفاظ میں دیا جائے جو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق ہوں۔ قطع نظر اس کے کہ ان کے مضمرات اور اثرات کیا ہوں گے۔ لیکن شاید ویسا کرنا نادانشمندی ہوگی، ایک الگ سیاسی پلیٹ فارم بنا کر بجز اس کے شاید کچھ بھی حاصل نہ ہو کہ ہم اچھوت بنا دئے جائیں۔ اور ملک کے تھوڑے بہت لوگوں کی جو حمایت و ہمدردی ہمیں حاصل ہے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ ہندوستان کے اطراف میں مذہب کے نام پر جو انقلابات آرہے ہیں اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑ رہا ہے اور ہندوستان کی مذہبی اکثریت بھی اپنا جواز اسی سے ثابت کرتی ہے، پچھلے آٹھ دس سالوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ جذبہ کتنا محرک اور مقبول ثابت ہوا ہے اور اس جذبہ کی جارحیت کا شکار کون ہوگا یہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے مقابل وہ لوگ ہیں جو کم از کم زبان سے تو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ چاہے ان کا عمل اس کے خلاف ہو یا ان کی خاموش تائید اس جذبہ کی جارحیت کو حاصل ہو اور یہی ایک گروہ ہے جس کا ساتھ دینا مسلمانوں کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ ویسے لوگوں کی بیشتر تعداد حکمراں کانگریس میں موجود ہے، کانگریس سے مسلمانوں کی ناراضگی اور خفگی صد فیصد جائز ہے۔

کانگریس کے مقابل دوسری وہ پارٹیاں جو مسلمانوں کو رجھا رہی ہیں ان کی صداقت اور خلوص پر اندھا ایمان شاید سیاسی دانشمندی نہ ہو،

ایک تو یہ کہ ایسی کئی پارٹیوں کی حیثیت علاقائی ہے، علاقائی پارٹیاں جو وقتی اور عارضی مسائل یا مصالح پر یکجا ہوگئی ہوں وہ پائدار نہیں ہوتی۔ وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر یا بکھر کر کانگریس میں ضم ہو جائیں گی۔ کانگریس کم از کم اپنی پالیسیوں اور الیکشن مینی فیسٹو کی حد تک دوسری پارٹیوں سے کہیں زیادہ صاف ذہن اور بہتر مقاصد رکھتی ہے، اس سے ناراض اور الگ ہو کر کسی اور کیمپ میں جانا وقتی جذبے کی تسکین تو مہیا کرسکتا ہے لیکن مسائل کا حل نہیں تلاش کرسکتا۔ وہ لوگ جو اکثریت کی اونچی ذات کے لوگوں کے خلاف محاذ بنا رہے ہیں، وہ بٹ رہے ہیں اور ان کی قوت کم ہورہی ہے پھر یہ نہ بھولئے کہ یہ طبقہ اگر اکثریت کی اونچی ذات والوں سے اختلاف رکھتا ہے تو انہیں اسباب کی بنیاد پر ان کے اختلافات مسلم اقلیت سے بھی ہیں۔
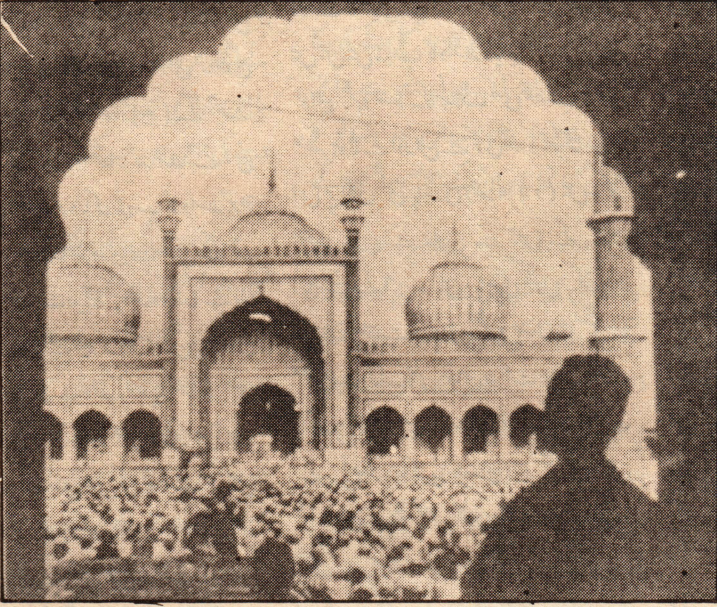
یہ تو ہوئی ایک عام بات لیکن چونکہ سیاسی وابستگیاں، مذہبی عقائد کی طرح نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ہونا چاہئے اس لئے اگر کوئی متبادل تیسری طاقت وجود میں آتی ہے جو مسلمانوں کے اقتصادی اور تعلیمی و تمدنی مسائل کا حل پیش کرتی ہے اور جو غیر جمہوری اور غیر سیکولر طاقتوں سے وقتی یا کثیر مدتی روابط نہیں رکھتی تو اس کی حمایت بھی اچھے نتائج پیدا کرسکتی ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے جیسے اب اقتصادی اور سماجی دباؤ کے اپنے منطقی نتیجہ کو پہنچنے کا وقت آپہنچا ہے۔ اکیسویں صدی کے آزاد انسان اور معاشرے اب انسانی اور سیاسی تاریخ کو نئی اصطلاحیں نئے مفاہیم اور نئے معیار دیں گے۔

الیکشن بیج بونے کا نہیں فصل کاٹنے کا موسم ہوتا ہے

ہمیں سیکولر محاذ کے امیدواروں کو ترجیح دینی چاہئے

تحریر: انجینئر محمد احمد علی گلبرگہ کرناٹک

آئندہ انتخابات میں مسلمان کیا کریں؟ یہ ایسا سوال ہے جو ہر الیکشن کے وقت اٹھایا جاتا ہے۔ الیکشن کے بعد اس سوال کو بھی بھلا دیا جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کا یہ عجیب طرز عمل ہے۔ عام حالات میں ہم غفلت برتتے ہیں اور عین الیکشن کے وقت بیدار ہوتے ہیں۔ بقول شخصے الیکشن تو فصل کاٹنے کا موسم ہوتا ہے فصل بونے کا نہیں۔ یہ امتحان دینے کا وقت ہے امتحان کی تیاری کا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عارضی اور وقتی سیاسی حل طے پاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ دراصل الیکشن کا معاملہ بڑا پیچیدہ اور اہمیت کا حامل ہے طویل غور و فکر بحث مباحثہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب آئندہ انتخابات سر پر آکھڑے ہیں اور اس دفعہ الیکشن ملت اور ملک دونوں کے لئے اہم ترین مسئلہ ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں اب کسی ایک پارٹی کی بالادستی یا واحد پارٹی سسٹم کمزور ہوگیا ہے اور مخلوط حکومت بنانے کی ضرورت درپیش ہے۔ بدلتے حالات، مواقع اور ترجیحات نے ووٹنگ کے عمل کو کافی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ لیکن ان ساری تبدیلیوں کے ساتھ ہی مسلم ووٹ بینک کی وقعت، اہمیت اور فیصلہ کن پوزیشن عیاں ہوگئی ہے۔ لیکن اس فیصلہ کن پوزیشن کے باوجود ایک منفی پہلو بھی ظاہر ہوا ہے وہ یہ کہ مسلمان اس سیاسی حربے کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ملک کی تمام پارٹیاں اور فرقے اس سے مستفید ہورہی ہیں۔ مسلمانوں کی پسماندگی بڑھتی جارہی ہے۔ پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں مسلم ارکان

> بدلے ہوئے حالات میں اب کسی ایک پارٹی کی بالادستی یا واحد سسٹم کمزور ہوگیا ہے اور مخلوط حکومت بنانے کی ضرورت درپیش ہے۔ بدلتے ہوئے حالات، مواقع اور ترجیحات نے ووٹنگ کے عمل کو کافی پیچیدہ بنا دیا ہے۔

کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ ایسا کیوں؟ اس کے لئے غور و فکر اور حالات کے سدھار کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ عام تجربہ ہے کہ الیکشن سے پہلے سب ہی پارٹیاں مسلمانوں سے خوش کن وعدے کرتی ہیں اور الیکشن کے بعد یہ سارے وعدے بھلا دئے جاتے ہیں۔ حکومت کی تشکیل کے بعد کچھ وعدے پورے کرنے کے لئے ضروری احکامات جاری ہوتے ہیں لیکن ان احکامات پر سرکاری مشینری عملدرآمد نہیں کرتی۔ گویا مسلمانوں کی ساری دوڑ دھوپ رائیگاں ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ سارا معاملہ سیاسی باربرداری (حمالی) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے بھی طویل کوشش کی ضرورت ہے۔ ملک گیر سطح پر مسلم دانشور، علماء، مشائخین، سوشل کارکن، سیاسی قائدین مل بیٹھ کے بے لوث خدمت کے جذبے کے ساتھ غور و فکر کرکے کوئی مفید موثر طریقہ کار اور سیاسی پالیسی وضع کریں۔ یہ کام طویل مدتی پالیسی کے طور پر ہونا چاہئے اور اس کے بعد ان طے شدہ تفصیلات پر عمل ہو اور اس پالیسی کو ملک کے کونے کونے میں شہری و دیہی علاقوں میں تحریک بنا کر چلایا جائے اور عام بیداری پیدا کی جائے جیسا کہ بی جے پی وغیرہ پارٹیاں "جن جاگرن" مہم کے ذریعے دیہات دیہات، قریہ قریہ کررہی ہیں۔ مسلم ادارے دانشور اس قسم کی کوشش کیوں نہیں کرتے اس کی وجہ واضح نہیں۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد یہ پہلو باعث اطمینان ہے کہ مسلمان چاہے اپنے مفاد کی حصول میں کامیاب نہ ہوئے ہوں لیکن پھر بھی نقصانات اٹھا کر ملک کے مفاد میں فرقہ پرستوں کے اقدام کو روکے ہوئے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا اب وقت نہیں ہے۔ الیکشن قریب ہے اس لئے کوئی فوری لائحہ عمل طے کرنا اشد ضروری ہے۔ طویل مدتی طریقہ کار کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی رکھنا ناگزیر ہے۔

قومی سطح پر آج جو اہم پارٹیاں وجود میں ہیں ان کے منشور، عزائم اور منصوبے عیاں ہوچکے ہیں علاوہ ازیں ان پارٹیوں کے کردار اور قول و عمل کا اظہار بھی ہوچکا۔ آج مسلمانوں کے سامنے اہم مسئلہ یہ ہے کہ فرقہ پرست اور مسلم دشمن طاقتوں کے اقدام کو روکا جائے اور ملک کے سیکولر کردار کو تقویت پہنچائی جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے (۱) اس سیکولر امیدوار کو ووٹ دیا جائے جو فرقہ پرست امیدوار کو ہرائے۔ گزشتہ الیکشن میں یہ کام آسان تھا کیونکہ فرقہ پرست پارٹی ایک تھی لیکن اب دوسری پارٹی کا بھی کردار مشکوک ہے اس لئے پارٹی کے ساتھ امیدوار کی کارکردگی دیکھنا ضروری ہے۔ زیادہ واضح طور پر کہا جائے تو یہ کہنا ہوگا کہ تیسرے محاذ یا سیکولر محاذ کے امیدواروں کو ترجیح دی جانی چاہئے جہاں ممکن ہو (۲) آزاد امیدواروں کی حمایت سے گریز مناسب

باقی صـ۱۵ پر

درگاہوں کی چادر سے مسلم ووٹوں کی خیرات

کیا مسلمان اور کانگریس کو چادر کے رشتے میں باندھنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے؟

تحریر: اقبال مسعود

معاصر صحافت کے اس کالم میں ہم مسلم معاملات، سیاسی حالات اور دوسرے اہم موضوعات پر معروف اہل قلم اور صحافیوں کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہم مختلف قومی اخبارات سے منتخب کرتے ہیں۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ قارئین دوسرے اخبارات کے قلم کاروں کے نظریات و خیالات سے واقف ہو سکیں کہ دوسری زبانوں کے اخبارات مذکورہ معاملات پر کیا موقف اختیار کر رہے ہیں

کیا چادر کانگریس کو مسلم ووٹ دلا سکے گی

اخبارات میں وزیر اعظم یا مسٹر ایس بی چوان کی طرف سے اجمیر شریف اور ملک کی دیگر درگاہوں کو چادر نذر کرنے کی خبریں آئے دن چھپ رہی ہیں اور ان میں ایسے مضامین بھی شائع ہو رہے ہیں جن میں یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کا ووٹ کس طرف جائے گا۔ مسلم پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ کی مخالفت جیسی باتیں بھی بیچ میں آجاتی ہیں۔ ہر شخص خواہ وہ میڈیا کے لوگ ہوں، مسلم لیڈران ہوں یا سیاستداں سے لے کر تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد رضا جوئی کی فضا سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔

میڈیا اور سیاست کی سطح پر اس معاملے میں اچھا خاصا فراڈ بھی ہوا ہے۔ کیا مسٹر نرسمہا راؤ کی چادر مسلمانوں کے ذہنوں سے بابری مسجد کے حادثے سے ملی ہوئی ہتک اور اس کے بعد کی خونریزی کو محو کر دے گی۔ ممکن ہے کہ وہ کسی اور بناء پر اسے بھلا دیں لیکن چادر کی وجہ سے نہیں۔ مسٹر راؤ بھی جانتے ہیں کہ مسلمان یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ سوانگ اور ریاکاری کیوں کی جارہی ہے اس نازک سوال کا جواب دینے کی کوشش آگے کی سطور میں کی گئی ہے۔

یہ بیان یقیناً چونکا دینے والا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں لیکن نراد چودھری کی تصنیف آٹو بایوگرافی ان نون انڈین کے صفحہ ۲۲۵ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۱۹۰۶ء کی سودیشی تحریک کے پس منظر میں مسلمانوں کے تئیں ہندوؤں کے تصور کے بارے میں چودھری نے یہی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ایک زمانے میں اپنے اوپر ان کے تسلط کی بناء پر تاریخی منافرت کا احساس رکھتے تھے، دوسرے یہ کہ فکری سطح پر ہم مسلمانوں کی طرف سے قطعاً بے نیاز تھے۔ تیسرے یہ کہ ہم اپنی معاشی اور سماجی حیثیت کے مسلمانوں جن سے ہمارا ذاتی طور پر واسطہ پڑتا تھا دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور چوتھے یہ کہ غریب طبقے کے مسلمانوں کے لئے ہم ہمدردی اور حقارت کا وہی ملا جلا رویہ رکھتے تھے جو ہم خود ہندو غریب طبقہ کے افراد کے لئے رکھتے ہیں۔ ان احساسات اور آج نوے سال بعد بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سنگھ پریوار کے مسلم مخالف پروپیگنڈے میں کس قدر یکسانیت ہے۔ ۱۹۰۶ء کے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے چودھری نے بیان کیا ہے کہ کس طرح بنگال کے نشاۃ ثانیہ اور سودیشی تحریک دونوں میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہندوستانی مسلم مشاہدین میں نراد چودھری سب سے زیادہ متجسس اور ضدی لیکن متعصب واقع ہوئے ہیں۔ وہ تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کے انجام کو ۱۹۴۷ء میں لڑنے اور ہاری ہوئی بازی جیتنے کا الزام دیتے ہیں۔ انہوں اپنی کتاب Continent Of Circe میں برقع پوش خاتون کو مخاطب کرکے پوری قوم کو پردہ پوش ہونے کا طعنہ دے کر ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا حد درجہ بے رحمانہ تجزیہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں ہندو مسلمان تعلقات دو طرفہ نوعیت کے نہیں بلکہ سہ طرفہ ہیں جس میں اب پاکستان اور جموں و کشمیر بھی شامل ہوگئے ہیں جب پاکستان یا جموں و کشمیر کے انتہا پسندوں کو امریکی امداد ملتی ہے یا اس میں اضافہ ہوتا ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں پر اشاروں ہی اشاروں میں الزام تراشیاں ہونے لگتی ہیں۔ چودھری نے اپنی کتاب میں جن ہندوستانی مسلمانوں کو ہاری ہوئی بازی سے تعبیر کیا ہے آج کیا بات ہے جو اسی ہاری ہوئی بازی پر اتنی عنایت ہو رہی ہے۔ یہی موقع ہے کہ ۱۹۰۶ء، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۹۵ء کے فرق کو متعین کرلیا جائے۔ ۱۹۰۶ء کے بعد سے برطانوی سامراج کی قریب الوقع واپسی ہی بنیادی تفریق کو تقویت دے رہی تھی۔ یہ رجحان ۱۹۴۷ء میں اپنے عروج پر پہنچا اور نتائج پوری طرح معلوم ہیں۔ مسلمانوں سے متعلق تقسیم ملک کے بعد کانگریسی پالیسی میں ہاری ہوئی بازی کا تصور غالب رہا لیکن انتخابی مصلحتوں کے پیش نظر کانگریس انہیں میٹھی گولیاں دیتی رہی۔ تقسیم کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ کم و بیش برطانوی حکومت جیسا ہی رویہ رکھا یعنی کہ ان کے لئے کم سے کم مادی تحفظ کی فراہمی۔ اگرچہ یہ طریقہ کار خاصا قسمت آزمائی کا تھا۔ رفتہ رفتہ پورے ملک کی پولیس نے بھی اسی مسلم مخالف رجحان کو اپنا لیا اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی کہیں کوئی فساد ہوا قیامت مسلمانوں پر ہی ٹوٹی۔ ۱۹۳۷ء سے ہی پنڈت نہرو نے مسلمانوں سے "اجتماعی سطح پر ربط" پیدا کرنا چاہا تھا اور اس فقرہ سے یہ تاثر قائم کیا گیا کہ مسلمان نہرو کے حاشیہ خیال سے اتنے ہی خارج تھے جتنے کہ بنگال کے نشاۃ ثانیہ کے علمبرداروں کے۔

۱۹۴۷ء میں نہرو کے پاکستان مخالف رویہ اختیار کرنے کے بعد سے ہی مسلمانوں کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر مسلمانوں کی تقدیر سنوارنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمانوں کو استعمال کرنے کی غرض سے اندرا گاندھی نے چودہ نکاتی پروگرام کے تحت مسلمانوں کے لئے روزگار کے مواقع وسیع کرنے کی عام ہدایات اپنے وزراء کو جاری کیں جن کا ظاہر ہے کہ کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور محترمہ یہی چاہتی بھی تھیں۔ راجیو گاندھی کی حکومت نے مسلم پرسنل لا کو بچا تو لیا لیکن بابری مسجد دے کر۔ راؤ حکومت نے اپنی بے عملی سے مسجد کے انہدام اور اس کے بعد کی خونریزی میں تعاون دیا۔ اور اب مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے:

"چادر قبول کیجئے اور اپنے پرسنل لا پر عمل کیجئے۔ ماضی کی باتیں بھول جائیے اور ہمیں ووٹ دیجئے۔" غیر مسلم حضرات نراد چودھری کی ایجاد کردہ مسلم نفسیات سے ناواقف یا اس کی طرف سے بے نیاز ہیں کیا کانگریس کو یقین ہے کہ یہ طریقہ کار موثر ثابت ہوگا۔ گزشتہ اسمبلی انتخابات میں شرد پوار نے اپنے ایک ساتھی سے بڑے تمسخر سے کہا تھا۔ "مسلمانوں کے پاس راستہ ہی کون سا رہ گیا ہے" اور غالباً چادر نذر کرنے کے پیچھے یہی خیال کارفرما ہے۔ یہاں دو سوال ذہن میں ابھرتے ہیں اولاً یہ کہ کیا مسلمانوں کے ووٹ واقعی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیا مسلمانوں کے ووٹ ایک ہی جگہ پڑنے والے ہیں۔ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں مل رہا ہے۔

بی جے پی اور شیو سینا کی چلائی ہوئی تحریک کے پیش نظر مسلم ووٹ کی کوئی اہمیت رہ نہیں جاتی تاوقتیکہ ذات پات کے سوال پر غیر مسلم طبقوں میں اختلاف رائے نہ پیدا ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ذہن سے بابری مسجد اور اس کے بعد کے خونی واقعات بھولنے والے تو نہیں ہیں لیکن چونکہ انہیں زندگی یہیں گزارنی ہے ان کی اپنی وفاداریاں الگ الگ ہیں اس لئے ووٹ تقسیم ہونا یقینی ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

●

بقیہ: ـــــ شاہ خرچ بیٹا

پر ہندوستان اور پاکستان دونوں کی مداخلت سے آزاد کشمیر بنانے کے مقصد کی توثیق کی تھی اور اس بیان سے کافی الجھنیں بھی پیدا ہوئیں تاہم بعد میں وہ ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی حمایت کرنے لگے۔

انگلینڈ کو خیرباد کہنے میں فاروق کے پس و پیش کی جھلک اس بات سے ملتی ہے کہ جب ۱۹۷۲ء میں دوستوں نے مشورہ دیا کہ وطن لوٹ جائیں اور اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان رہائی کا معاہدہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا تو وہ اپنی بیوی پر اس ارادے کے اظہار کی جرات نہ کرسکے۔

۱۹۷۷ء میں ان کی اس پر شور انتخابی مہم کا ذکر بھی اس کتاب میں ہے جس نے وادی سے ان کے رشتے کو پھر سے استوار کیا۔ نتیجتاً نیشنل کانفرنس کی شاندار فتح ہوئی اور شیخ عبداللہ کے لئے فاروق عبداللہ کو اپنی جگہ پر پارٹی کا صدر بنانے کا صاف راستہ مل گیا۔ شیخ کو اپنا خاتمہ قریب نظر آرہا تھا اور وہ فاروق کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے اور یہ خواہش ۱۹۸۲ء میں ان کی موت کے ساتھ ہی پوری ہو پائی۔ اگرچہ باپ اور بیٹے کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی لیکن شیخ عبداللہ کے خاندان کے لئے گہری ترجیح کا رجحان غالب آگیا۔

جیسا کہ کتاب میں مذکور ہے فاروق اس وقت تک بھی سیاست میں نومشق ہی تھے۔ وزیر اعلی بننے کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ بدعنوانی کا الزام لگا کر تمام وزراء کو نکال دیا۔ عوام کو اس سے خوشی تو ہوئی لیکن تجربہ کار اور با رسوخ لوگوں کے وقار کو اس فیصلے سے ٹھیس بھی پہنچی۔ ریاست میں پھیلی ہوئی بدعنوانی جس نے شیخ عبداللہ اور بہت سے لیڈروں کی شہرت کو دھندلا کر دیا تھا اسے دور کرنے کی جو توقعات عوام نے فاروق سے وابستہ کی تھیں اس پر بھی وہ پورے نہ اترے۔

اس کے بعد انہوں نے وادی میں مزید کانگریسی سیٹوں کے مطالبے پر مخالف دھڑے میں شامل ہوکر اندرا گاندھی کو ناراض کیا اور اندرا گاندھی نے جگ موہن کی وساطت سے فاروق کی حکومت پلٹ دی۔ فاروق کی موٹر سائیکل سواری وہ بھی بعض اوقات فلم اسٹاروں کے ساتھ اور دیگر شوق وادی کے عوام میں انہیں مقبول نہ بنا سکے۔ مصنف نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۸۹ء میں جب شبیر شاہ کے والد کی پولیس حراست میں موت ہوئی تو فاروق فوجی افسران کے ساتھ گولف کھیلنے میں مصروف تھے۔ اس سے قبل باوجود اس کے کہ ان کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس علی محمد وٹالی کو انتہا پسندوں کی طرف سے گولی مارنے کی دھمکیاں مل رہی تھیں تو انہوں نے سنگاپور کا دورہ کیا۔ مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی بیٹی روبیہ سعید کے اغوا کے وقت وہ انگلینڈ واپس گئے اور ان کا رد عمل یہ تھا کہ لوگ اس مسئلہ کو سلجھا لیں گے۔ اپنے مشیروں کے اصرار پر ہی وہ سری نگر واپس آئے تھے اور اغوا کاروں کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب کشمیر کے حالات پر مرکز نے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے دوبارہ جگ موہن کو گورنر بنایا تو فاروق کو معلوم ہو گیا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ انہوں نے استعفی دیا اور انگلینڈ کی راہ لی۔ اس کے بعد سے آج تک وہ آمد و رفت کا سلسلہ رکھے ہوئے ہیں اس کوشش میں کہ مرکز بغیر جدوجہد اور تصادم کے جموں و کشمیر کو اس کی سابقہ حیثیت دینے کا وعدہ کرلے۔ اب وہ کشمیر میں اپنا وقت زیادہ تر گزارتے ہیں۔

لالو جی انہیں معاوضہ دیجئے

میں حکومت بہار کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ۹ / اگست ۱۹۹۵ء کو صلحا منوروا گھاٹ سب ڈویژن روسڑا ضلع سمستی پور میں کشتی ڈوبنے کا حادثہ ہوا تھا۔ اور اس سے قبل پٹنہ اور بختیار پور میں بھی کشتی ڈوبی تھی۔ اس موقع پر وزیر اعلی لالو پرشاد نے ڈوبنے والوں کے اہل خانہ کو پچاس ہزار روپے معاوضہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ میں وزیر اعلی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ سوتیلاپن کا سلوک کیوں؟ وزیر اعلی لالو پرساد سے گزارش کرتا ہوں کہ صلحا منوروا گھاٹ پر حادثے میں شکار ہونے والوں کے ورثاء کو فوری طور پر معاوضہ دیا جائے۔ امید کہ وزیر اعلی ہماری درخواست اور آئین کا خیال کرتے ہوئے موثر قدم اٹھائیں گے۔

محمد شاکر علی صلحاوی

شیخ عابد کی مسجد نگینہ پول، دریا پور۔ احمد آباد

سب کو آزمایا

ہم نے تمام پارٹیوں کو آزمایا لیکن سب مسلمانوں کے خلاف نکلیں۔ بی جے پی کھل کر مسلمانوں کی برائی اور ان کے خلاف نفرت کا زہر اگلتی ہے کانگریس آئی مسلمانوں کو اندر ہی اندر کاٹتی ہے اور ان میں ذات پات کا بیج بوتی ہے اور مسلمانوں کو بانٹتی ہے۔ ایک طرف نرسمہا راؤ مسلمانوں کے تحفظ کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف مدن لال کھورانہ اماموں کو تنخواہ دینے کی حمایت کرتے ہیں، یہاں وی پی سنگھ اور ملائم سنگھ یادو مسلمانوں کو ریزرویشن دے کر طبقہ واریت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور کانشی رام، مایاوتی بی جے پی کی حمایت لے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اقلیتوں کے ہمدرد نہیں ہیں۔ تمام مسلمانوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تمام چھوٹی موٹی پارٹیوں کو ایک کر کے نیشنل مسلم فرنٹ کی بنیاد ڈالیں۔ انشاء اللہ ہم اقتدار میں ضرور آئیں گے اور اس ملک کے اندر انصاف، عدل اور ترقی ہوگی۔

زبیر اختر۔ برہانپور (ایم پی)

عبدالحمید کی بیوہ کا برا حال

۱۹۶۵ء کی ہندوپاک جنگ کا سورما حولدار عبدالحمید وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوگیا اور ہندوستان کو فتح سے ہمکنار کرا دیا۔ لیکن اس بہادر کی ۶۰ سالہ بیوہ رسولن بی بی گذشتہ ۳۰ سالوں سے اپنے شوہر کے مزار کے دیدار و فاتحہ خوانی کو تڑپ رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پتہ نہیں اس زندگی میں ان کے مزار پر جاسکوں گی یا نہیں۔ جاؤں بھی تو کیسے تمام کوششیں بے سود ہوگئیں نہ حکومت اجازت دیتی ہے نہ فوج۔ رسولن بی بی چڑکر کہتی ہے کہ آپ اخبار میں چھاپ کر کیا کریں گے۔ گونگی بہری اندھی حکومت پر اس کا کوئی اثر ہونے سے رہا۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت کی طرف سے بارہ بیگھہ زمین دینے کا اعلان ہوا لیکن ملی سات بیگھہ۔ رسولن بی بی کو افسوس ہے کہ بچے کم سنی میں یتیم ہوجانے کی وجہ سے زیادہ لکھ پڑھ نہ سکے اور کوئی بڑی نوکری حاصل نہ کرسکے۔ پنشن کے متعلق رسولن بی بی نے بتایا کہ صرف ۲۰۰ روپیہ دس سے پندرہ سالوں تک ماہانہ ملا اب کچھ دنوں سے ادھر ایک ہزار ماہوار ملنے لگا ہے، وہ کہتی ہے کہ اس حقیر سی رقم سے بس اللہ کے بھروسے زندگی کو کھینچ رہی ہے۔ لیکن افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے بیٹے بھی ان پر توجہ نہیں دیتے۔ اور رسولن بی بی گھل گھل کر اپنی زندگی کاٹ رہی ہے۔

تسنیم بلخی

نالندہ۔ بہار

دہلی یونیورسٹی میں خطبہ

دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالحق کی سربراہی میں علمی و ادبی سرگرمیاں جاری ہیں۔ انہیں سرگرمیوں کے تحت گزشتہ دنوں دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر محمد حسن نے "اودھ میں اردو ادب کا تہذیبی و فکری پس منظر" کے عنوان سے نظام خطبہ دیا۔ اپنے خطبے میں انہوں نے اودھ کے علاقے میں تخلیق پانے والے مختلف اصناف ادب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ادب کا یہ منظر نامہ ناقابل فراموش سچائیوں کا گہوارہ ہے جس میں ادب و دانش کو ہی فروغ حاصل نہیں ہوا بلکہ علمی و فکری توانائی بھی حاصل ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اس دور میں ایک نیا سیاسی، تہذیبی اور تخلیقی شعور پیدا کیا جس کے نتیجے میں اودھ کی سرزمین پر اردو ادب کے بہت سے اصناف کو عروج حاصل ہوا

متھلانچل کے عوام میں بے چینی

دربھنگہ۔ سمستی پور بڑی ریل لائن کے کام کو اچانک بیچ میں ہی روک دینے سے دربھنگہ ہی نہیں بلکہ پورے متھلانچل یعنی دربھنگہ، سمستی پور، مدھوبنی، جے نگر، سیتامڑھی کے علاقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے اور سیاسی پارٹیوں کے مظاہروں اور احتجاجی پروگراموں کا سلسلہ چل پڑا ہے۔

۱۸ نومبر کو بی جے پی کا بند تھا جس میں ٹرین کے دو ڈبے نذر آتش کردئے گئے اور فون کے کھمبے تقریبا دس کلومیٹر تک اکھاڑ دئے گئے۔ اس مسئلے کو لے کر ۲۵ نومبر کو جنتا دل کے ایم پی مسٹر علی اشرف فاطمی نے بھی احتجاج کیا۔ ان کے ذریعہ بند کی اپیل کی حمایت ۴۱ سیاسی اور سماجی تنظیموں نے کی جس کے تحت بہار حکومت اور مرکزی حکومت کے تمام دفاتر بند رہے۔ اس میں مسٹر علی اشرف فاطمی نے دربھنگہ ریل اسٹیشن پر دھرنا دیا۔ اور کہا کہ ہم اس علاقہ کی ترقی چاہتے ہیں اس کے لئے ہمیں جو بھی قدم اٹھانا ہوگا اٹھائیں گے، ہم متھلانچل کے عوام کو دہلی کے اندر نیچا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم مرکزی سرکار سے یہ حق چھین کر رہیں گے۔

شاہد سلام، خان چوک۔ دربھنگہ

ملت فروشوں سے احتیاط برتیں

ملی ٹائمز انٹرنیشنل کے تازہ شمارہ میں سوڈان کی اسلامی حکومت سے متعلق مضمون معلوماتی مگر مختصر ہے۔ الیکشن کے بارے میں محفوظ الرحمن صاحب کا مشورہ کہ مسلمان کیرالہ کے مسلمانوں کی طرح ایک الگ اور موثر طریقہ عمل والی پارٹی بنا کر الیکشن میں حصہ لیں اور حکومت میں بھی حصہ داری حاصل کریں بہت مناسب ہے لیکن اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اب چونکہ الیکشن سر پر آکھڑا ہے اس لئے نئی پارٹی کی تشکیل دشوار اور وقت طلب کام ہے۔ اسے مستقبل کے لئے چھوڑ دیں اور اب فوری عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ فرقہ واریت کے اقدام کو روکا جائے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ کام کرنا ہوگا کہ ملت مسلمہ میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ ووٹوں کی تقسیم کو روکا جائے۔ سیاسی دلالوں اور ملت فروشوں سے اجتناب برتا جائے۔

ایم زاہد حسینی

گلبرگہ (کرناٹک)

مدھیہ پردیش اولڈ بوائز کے احساسات

ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن مدھیہ پردیش بھوپال کے جملہ اراکین اور ممبران یونیورسٹی کے سنگین حادثہ پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ والدین سے ہماری گزارش ہے کہ یونیورسٹی کی دیرینہ روایات کے تقدس کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو اب آگے بڑھ کر سامنے آنا لازم ہوگیا ہے۔

طلباء سے گزارش ہے کہ آج مقابلے کا دور ہے اور مقابلہ کے لئے بہترین اور اعلی تعلیم ہی آپ کا ہتھیار ہے اور وہ صرف پورا وقت تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اساتذہ سے ہمارا کہنا ہے کہ آپ کا اور طلباء کا رشتہ ازل ہی سے تقدس کی ڈوریوں سے بندھا رہا ہے۔ اٹھئے اور مشترکہ طور پر حالات کو معمول پر لانے میں ایک دوسرے کے معاون بنئے۔ دیرینہ روایات کی پاسداری کیجئے۔ طلباء کو سمجھائیے۔ انتظامیہ کو مناسب اور قابل عمل مشورے دیجئے۔

وی سی سے کہنا ہے کہ آپ سے سب کی توقعات وابستہ ہیں۔ خدا کرے آپ طلباء کا مستقبل انہیں جلد واپس کرنے میں پہل فرمائیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ سیاسی اور سماجی حضرات سے کہنا ہے کہ انتہائی پرخلوص جذبہ کے ساتھ اٹھئے اور یونیورسٹی کے ماحول کو سازگار بنانے میں اپنا کردار نبھائیے اور انتظامیہ، اساتذہ، والدین اور طلباء کے ساتھ تعاون فرمائیے تاکہ وہ اور آئندہ نسلیں آپ کو اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔

سعید اختر سکریٹری الیوسی ایشن

نعیم صدیقی جوائنٹ سکریٹری

پرویز صالح جوائنٹ سکریٹری

معذرت

گزشتہ شمارے میں ابلیس کے باغی رفیق کے انٹرویو کی پہلی قسط قارئین نے ملاحظہ کی۔ اس انٹرویو کی دوسری قسط ہم کنہیں مجبوریوں کی بناء پر اس شمارے میں نہیں دے پارہے ہیں انشاء اللہ اگلے ہفتے سے یہ سلسلہ پھر شروع ہوجائے گا ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

کیا تسلیمہ نسرین کا دماغ درست ہے

کیا تسلیمہ نسرین کا دماغ درست ہے؟ اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بنگالی مصنفہ تسلیمہ نسرین نے ایک بحث میں حصہ لیتے ہوئے اپنی تقریر میں پھر اپنے احمقانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ "جمہوریت اور اسلام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔" دوسری بات یہ کہ "اسلامی قانون کے مطابق عورتوں کو مردوں کے مقابلے دوسرے نمبر کا درجہ حاصل ہے۔" اگر تسلیمہ نسرین خلوص دل اور نیک نیتی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دنیا کو مذہب اسلام نے ہی جمہوریت کا تصور عطا کیا ہے۔ بانی اسلام نے اپنی زندگی میں وہ نمونہ حیات پیش کئے ہیں جو دنیا کی کوئی قوم آج تک پیش نہ کرسکی۔ اگر قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جمہوری اقدار کی صحیح اور مکمل عملداری صرف اور صرف مذہب اسلام کے اصول اور قوانین کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

اسی طرح مذہب اسلام نے عورتوں کو ذلت کے گھنگھور اندھیروں سے نکال کر عزت کی بے مثال روشنی عطا کی ہے۔ ماں کے قدموں میں جنت کا تصور دے کر عورت کے تقدس کو ظاہر کیا ہے۔

محمد اشفاق بن اسحاق

بدنیرہ بھولجی۔ ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)

قرآن شریف اور ہم

کیا ہم اپنی ذمہ داریوں کو قرآن کی روشنی میں پورا کرتے ہیں؟

کیا ہم اپنی ذمہ داریوں کو قرآن کے احکام کی روشنی میں پورا کرتے ہیں؟ کیا ہم اچھے ہیں جن کے لئے قرآن نازل ہوا ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یا وہ اچھے ہیں جو قرآن نازل ہونے سے پہلے تمام برائیوں میں مبتلا تھے۔ ان امور پر غور کرنے کا آج وقت آیا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگی کا جائزہ لیں۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں، قرآن ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ آپس میں اتحاد قائم کریں تو یقینا ہماری زندگیاں بدل جائیں گی، ذہن و فکر کی اصلاح ہوگی اور فتح و نصرت حاصل ہوگی۔

مولانا محمد علی خاں

عثمان آباد (مہاراشٹر)

مظلوم مسلمانوں کو جلد رہا کیا جائے

۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ء کو لدھیانہ میں ہوئے بم دھماکہ کے سلسلہ میں بے قصور مسلمانوں کی گرفتاری کے خلاف انڈین مسلم کونسل کے ہزاروں ورکرس نے احتجاجی جلوس نکالا۔

انڈین مسلم کونسل پنجاب کے صدر جناب عتیق الرحمن لدھیانوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ پنجاب کے ڈی جی پی اور پولیس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے جن کے بیان کی وجہ سے لدھیانہ میں ہندو مسلم تناؤ پیدا ہوگیا ہے۔ انہوں نے اپنا میمورنڈم ڈپٹی کمشنر لدھیانہ اور ایس ایس پی لدھیانہ کو دیا اور یہ کہا کہ پولیس افسروں نے ناجائز طور پر مسلمانوں کو پکڑ کر جیلوں میں بند رکھا ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور ان کو فوری طور پر معطل کیا جائے۔ اس موقع پر ایس ایس پی لدھیانہ نے ہزاروں مسلمانوں کے سامنے پنجاب پولیس کی طرف سے معذرت چاہی اور یہ یقین دلایا کہ لدھیانہ کے مسلمانوں کو تحفظ دیا جائے گا۔

صدر کونسل نے کہا کہ مسلمان ہمیشہ سے پنجاب کی خوش حالی اور ترقی کے لئے کام کرتے رہے۔ لدھیانہ جو کہ پنجاب کا ایک صنعتی شہر ہے، میں تقریبا چار لاکھ مسلمان رہتے ہیں انہوں نے مانگ کی کہ اس بم دھماکہ کی سی بی آئی سے جانچ کرائی جائے۔ یہ جلوس ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے جامع مسجد لدھیانہ کے گیٹ پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔

پریس سکریٹری

انڈین مسلم کونسل پنجاب

صدر دفتر جامع مسجد لدھیانہ

بورڈ اور جماعت اسلامی پر تجزیہ پسند آیا

۱۵ نومبر کا شمارہ مطالعہ سے گزرا۔ مسلم پرسنل لابورڈ کے حالیہ ہفتہ تحفظ شریعت مہم کا فیصلہ اور علی میاں ندوی کے موقف کو خوب اچھی طرح واضح کیا گیا اور دوسرا مضمون جماعت اسلامی کا سیاسی سیل کے بارے میں مرکزی مجلس شوری کے فیصلہ کا حقیقت پسندانہ اور دردمندانہ تبصرہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر قلب و جگر میں ہلچل اور بے چینی کا موجب بنا۔ میں اس جریدہ کا مستقل قاری بننے کا ارادہ رکھتا ہوں اس سلسلہ میں ادارہ سے رہنمائی کا خواستگار ہوں۔

محمد مجیب الاعلی

باغ جہاں آرا۔ حیدر آباد

تنقید پسند نہیں آئی

مجھے ملی ٹائمز مورخہ یکم تا ۱۵ نومبر پڑھنے کا موقع ملا۔ آپ نے درج ذیل سطور قلم بند کیا ہے۔

پرسنل لابورڈ کے حالیہ احمد آباد اجلاس میں نظریاتی کنفیوژن کا جائزہ۔

اس سرخی کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ "البتہ ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی ان کے حصے میں کنفیوژن اور مایوسی کے علاوہ اور کچھ نہیں آیا۔" اس طرح کی تنقید ہمیں پسند نہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ آئندہ بہتر ڈھنگ سے تنقید کیا کریں گے اس تحریر سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوگا نہ کہ اتحاد و اتفاق۔ اگر آپ کا ملی پارلیمنٹ نفاذ شریعت کروا سکتا ہے تو زہے قسمت۔

جماعت اسلامی کا سیاسی SALE

اس عنوان سے آپ نے جو جماعت اسلامی پر تنقید کی ہے وہ بھی مجھے پسند نہیں آئی۔ اچھا ہوگا اگر آپ آئندہ بہتر ڈھنگ سے تنقید فرمایا کریں۔

معظم علی صدیقی

چترپور ضلع ہزاری باغ (بہار)

ایک سال بعد بھی چیچن مجاہدین کا جذبہ حریت جوان ہے

چیچنیا میں روسی بربریت کے ایک سالہ دور کا جائزہ

گزشتہ سال ۱۱ دسمبر کو روس نے چیچنیا پر تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے حملہ کردیا تھا۔ گزشتہ دنوں اس انسانیت سوز حملے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ہزاروں چیچن باشندوں نے روسی فوج کی موجودگی اور روسیوں کے سہارے قائم نام نہاد چیچن حکومت کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کا جہاد آزادی جاری رہے گا۔ مظاہرین تباہ شدہ دارالحکومت گروزنی میں صدارتی محل کے پاس ایک سینماہال کے قریب جمع ہوئے۔ انہوں نے روس مخالف نعروں کے ساتھ نعرہ تکبیر بھی بلند کیا اور نمازیں ادا کیں۔ پورے مظاہرے کے دوران روسی وزارت داخلہ کی فوجیں مظاہرین پر نگاہ رکھے ہوئی تھیں اور ہیلی کاپٹر نیچی پروازیں کرکے عوام کو ہراساں کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود عوام خوفزدہ نہیں ہوئے۔ لیلی نامی ایک خاتون کے یہ الفاظ غالبا تمام ہی مظاہرین کی دلی آواز تھے۔ انہوں نے نیچی پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو مکا دکھا کر کہا کہ "وہ ہمیں ایک سال سے ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن یہ تکنیک کامیاب نہیں ہوگی۔"

۱۱ دسمبر کو حملہ کرنے کے بعد روس کی فوجیں تقریبا آٹھ مہینوں تک چیچن مجاہدین سے برسرپیکار رہیں۔ اس دوران انہوں نے گروزنی اور دوسرے کئی شہروں اور گاؤوں کو خاک و خوں میں تبدیل کردیا۔ بالآخر مجاہدین اور روسیوں کے درمیان ۳۰ جولائی کو جنگ بندی ہوگئی۔ بظاہر یہ جنگ بندی ابھی تک نافذ ہے لیکن کم لوگوں کو امید ہے کہ یہ زیادہ دیر تک قائم رہے گی۔ تقریبا ہر روز کہیں نہ کہیں روسیوں اور چیچن گوریلاؤں کے درمیان مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ حال ہی میں مجاہدین نے سابق کمیونسٹ چیچن لیڈر جو روس کی حمایت سے ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء کو وزیراعظم بنے ہیں، ان پر گھات لگاکر حملہ کیا جس میں وہ زخمی ہوگئے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روس زور زبردستی سے امن قائم کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔

نام نہاد امن معاہدے پر دستخط کے بعد چیچن گوریلاؤں نے روسیوں پر کم از کم ایک ہزار مرتبہ حملہ کیا ہے۔ جوابا وہاں موجود ساٹھ ہزار سے زیادہ روسی فوجیوں نے شہروں اور گاؤوں پر بمباری کرکے مزید تباہی مچائی ہے۔ روسی حمایت سے بنائے گئے وزیراعظم زوگائیف پر حملہ اس لئے ہوا تھا کہ انہوں نے اور ان کی نام نہاد پارلیامنٹ نے ایک روسی پلان کو منظوری دے دی ہے مگر چیچن عوام بجاطور پر سمجھتے ہیں کہ اس انتخاب کا مقصد روسی قبضے اور حکومت کو قانونی جواز فراہم کرنے کی ناکام کوشش کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ جوہر دودائیف، سابق صدر کے ایک ترجمان نے کہا کہ اس وقت تک کوئی انتخاب نہیں ہوسکتا جب تک آخری روسی فوجی چیچنیا سے نکل نہیں جاتا۔ دودائیف پہاڑوں میں واقع اپنی پناہ گاہ سے گوریلا جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

روسی حملے کے ایک سال بعد چیچنیا تباہ و برباد اور خستہ حال ہے لیکن اس کے عوام کا جذبہ حریت پوری طرح بیدار ہے۔ بلاشبہ روسی ملک کے دو تہائی حصے پر قابض ہیں لیکن ایک تہائی پہاڑی علاقہ جوہر دودائیف کے قبضے میں ہے۔ دودائیف کو ایک طرح سے شکست کے بعد گروزنی گزشتہ سال فروری میں چھوڑنا پڑا تھا۔ اسی کے ساتھ انہیں اپنے بڑے ہتھیاروں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ مزید برآں تیل کی دولت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس وقت ان کے پاس ایک اندازے کے مطابق دو ڈھائی ہزار گوریلا موجود ہیں۔ لیکن چیچن عوام میں وہ اب بھی کافی مقبول ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے گروزنی کے قریب ایک بھرپور کانفرنس کی تھی جس سے ان کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

۳۰ جولائی کو قائم ہونے والی جنگ بندی کے مطابق روس کو اپنی فوجیں واپس بلانا اور چیچن عوام کو اپنے ہتھیار جمع کرنا تھا۔ بعض گاؤوں کے لوگوں نے ہتھیار جمع بھی کیا لیکن جب دوسروں نے دیکھا کہ روسی واپس جانے کا نام نہیں لیتے تو انہوں نے ہتھیار جمع کرانا بند کردیا۔ اس کے بعد سے روسیوں پر گاہے بگاہے خصوصا رات کے وقت حملے ہوتے رہتے ہیں۔ جوابا روسی ان گاؤوں پر بمباری کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ شبہ کرتے ہیں کہ وہاں چیچن مجاہدین چھپے ہوئے ہیں۔ اب تک ہزاروں لوگ جس میں روسیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے لقمہ اجل بن چکے ہیں اور اب ادھر اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔

۳۰ جولائی کے بعد سے سہ طرفہ امن مذاکرات ہوتے رہے تھے جس میں روس کے علاوہ صدر جوہر دودائیف اور روسی حمایت سے قائم چیچن حکومت کے نمائندے شریک رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ ماہ یعنی نومبر میں یہ مذاکرات اس وقت ملتوی کردئے گئے جب گوریلاؤں نے روسی فوجوں کے سپریم جنرل اناتولی رومانوف کو شدید زخمی کردیا۔ جنرل ابھی تک بے ہوشی کی حالت میں موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس حملے کے بعد صدر یلتسن نے چیچنیا میں ایمرجنسی نافذ کردی۔ ان کے بعض مشیروں نے حملہ کرکے جنرل دودائیف کو ہمیشہ کے لئے ختم کردینے کی صلاح دی۔ لیکن یلتسن اس سے باز رہے۔ کیونکہ انہیں اندازہ ہے کہ ایسا کوئی بھی حملہ انہیں سیاسی طور پر موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ ابھی تک روس میں ایک بڑا طبقہ یلتسن کی چیچنیا پر حملے کے لئے تنقید کررہا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ صدر یلتسن نے اس بے مقصد جنگ میں ہزاروں روسی جوانوں اور اربوں ڈالر ضائع کردئے۔ اس کے علاوہ یلتسن کو یہ بھی ڈر ہے کہ اگر انہوں نے دوبارہ بھرپور حملہ کیا تو بین الاقوامی برادری ایک بار پھر ان کی زبردست مذمت کرے گی۔ اس کے ساتھ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ روسی فوجی چیچنیا میں اپنی مستقل موجودگی کے خلاف ہیں اور کتنے کھل کر اپنی حکومت کی غلط پالیسیوں کی تنقید کرتے ہیں۔ ان سب باتوں کے پیش نظر یلتسن نے فیصلہ کیا کہ چیچنیا میں دوبارہ جنگ نہ چھیڑی جائے کیونکہ موجودہ حالات میں ایسا کوئی بھی اقدام ان کے لئے سیاسی طور پر نقصان دہ ہوگا۔ لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ چیچنیا میں اس وقت جو صورت حال ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جنگ کسی بھی وقت دوبارہ بھڑک سکتی ہے۔

بقیہ: مبلغ اسلام

اجتماعات سے خطاب کیا۔ ملیشیا میں اور دوسری جگہوں پر بھی یوسف اپنے ماضی اور حال کی روشنی میں اسلام کی تعلیم کو اجاگر کرتے ہیں۔ سفید عبا اور عمامے میں ملبوس، لمبی داڑھی والے یوسف اسلام جب تقریر کرتے ہیں تو سامعین کو مسحور کردیتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں "اسلام میں میوزک حرام نہیں ہے۔ آپ قرآن میں یہ نہیں پائیں گے کہ میوزک حرام ہے۔ یہ زندگی کا حصہ ہے۔ چڑیاں گاتی ہیں۔ سمندر غراتا اور ہوائیں سرسراتی ہیں۔ یہ سب میوزک ہے۔ لیکن جب میں نے زیادہ گہرائی سے مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا کہ میوزک سے متعلق بہت سی چیزوں اور اسلام کے درمیان بہت اختلاف ہے۔" چنانچہ یوسف نے اس پیشے کو ترک کرکے اپنے آلات موسیقی ایک خیراتی ادارے کو دے دئے۔ اپنے اسلام لانے سے ذرا قبل ایک گانے میں یوسف نے اپنی بدلتی ہوئی کیفیت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس مشہور گانے کی پہلی دونوں سطریں اس طرح ہیں:

The sun has Risen

The Morning has broken

(سورج طلوع ہورہا ہے صبح پھوٹ رہی ہے)۔ اس گانے کی ریکارڈنگ کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

اس وقت یوسف برطانیہ کے ۲۰ لاکھ مسلمانوں کے ایک اہم لیڈر ہیں۔ وہ اس مسلم بورڈ کے صدر ہیں جو پورے برطانیہ میں ۴۴ اسلامی اسکول چلارہا ہے۔ وہ چار خیراتی تنظیموں کے بھی روح رواں ہیں۔ یوسف مدت سے مغرب کے زبردست نقاد ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں "مغرب کی نام نہاد ترقی اخلاق اور انسانیت سے تہی دامن ہے۔" مغرب کے زوال کی ان کے نزدیک کئی علامتیں ہیں، خاص طور سے شادی، جو محض ایک قانونی معاہدہ ہے جس میں اخلاق کا کوئی رول نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ادارہ تباہ و برباد ہوکر مغرب سے خاندانی نظام کا دیس نکالا کرچکا ہے۔

یوسف شادی شدہ ہیں اور ان کے پانچ بچے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ قرآن کے مطالعے سے انہیں معلوم ہوا کہ انسان کو اپنا وقت تین حصوں میں بانٹنا چاہئے۔ ایک تہائی اپنے خاندان کے لئے، اتنا ہی اپنے لئے اور آخری تہائی عبادات اور فروغ اسلام کے لئے۔ یوسف کہتے ہیں کہ وقت کی اسی تقسیم کے مطابق وہ زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

●

بقیہ: سیکولر محاذ

ہوگا (۳) جہاں تک ممکن ہو کسی بھی حالت میں مسلم ووٹ کو منقسم نہ ہونے دیں۔ یہ تین نکات فوری امکانی طرز عمل اور مسئلہ کا ایک آسان حل ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دانشوران ملت کو ایک طویل مدتی پالیسی وضع کرنے کی بھی تحریک چلانی ہوگی۔ طویل مدتی پالیسی کے لئے (۱) کیرالہ فارمولہ یعنی مسلمانوں کو علاقائی اور قومی بنیاد پر پارٹی بن کر پارٹی کی حیثیت سے الیکشن لڑکر حکومت میں حصہ داری اور نمائندگی حاصل کرنی چاہئے۔ (۲) یا بصورت دیگر دلت۔ مسلم۔ پسماندہ طبقات کا ایک مشترکہ محاذ بناکر حکومت پر قبضہ کی کوشش کرنی ہوگی اس کو یوپی فارمولہ کہا جاتا ہے۔ لانگ ٹرم پالیسی کی تدوین و تشکیل کے لئے طویل مدت تک جدوجہد کرنی ہوگی۔ اگر پرخلوص کوشش اور میڈیا کے صحیح استعمال کے ذریعہ ملک گیر پیمانہ پر تشہیر و بیداری کی تحریک چلائی جائے تو فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈہ اور کارکردگی کو ناکام بنایا جاسکتا ہے۔

●

بقیہ: ایرانی تجارت

معاشی تعاون کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور مقدور بھر اپنے مواصلاتی نظام کو بہتر بنارہے ہیں۔ ای سی او پہلے ہی ایک بحری راستہ، ایک علاقائی بینک اور ایک انشورنس کمپنی قائم کرچکی ہے۔ ایک ای سی او ائرلائن کے قیام کا بھی پروگرام ہے۔ ایسا لگتا ہے آئندہ چند سالوں کے بعد پاکستان سے لے کر سنٹرل ایشیا تک پھیلا ہوا ایک نیا معاشی مارکیٹ وجود میں آجائے گا جو ایک طرف چین سے دوسری طرف روس تک اور ترکی کے راستے یوروپ سے ملا ہوا ہوگا۔ بلاشبہ ایک دو تہائی بعد اس معاشی و تجارتی مارکیٹ کے ممبر ممالک کی قسمت چمک سکتی ہے۔

●

مسلم مجلس مشاورت کی گاڑی کو پٹری پر لانے کی

تمام تر توقعات خاک میں مل گئیں

اختر قاسمی دیوبند

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کو بالاخر وہ نیا چہرہ مل ہی گیا جس کے لئے کچھ پارسا حضرات غالبا اپنی پارسائی کا بھرم رکھنے کے لئے کئی برسوں سے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھے۔ گزشتہ ماہ لکھنؤ میں مشاورت کی تشکیل نو کے بعد جو نیا ڈھانچہ سامنے آیا وہ اس اعتبار سے پہلے والے ڈھانچے سے قدرے مختلف ہے کہ اس میں کچھ ایسے حضرات کو جگہ نہیں مل سکی ہے جو اپنی گوناگوں سرگرمیوں کے سبب بڑی حد تک متنازعہ بن چکے تھے۔ لیکن اس صورت حال کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جو تبدیلی سامنے آئی ہے وہ صرف چہرے کی حد تک ہی ہے۔ باقی اور کچھ نہیں بدلا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یہ نیا چہرہ حاصل کرنے کے لئے وہی سارے حربے بھی استعمال کئے گئے جو اب تک ایک خاص گروپ کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پہلے ہی کی طرح اس بار بھی کچھ لوگوں کو ضابطے کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے بروقت رکن قرار دیا گیا اور کورم پورا کرنے کے لئے انہیں بھی ووٹ دینے کا حق دے دیا گیا۔ اس راز کا انکشاف کسی اور نے نہیں بلکہ خود اس وقت کے جنرل سکریٹری مولانا احمد علی قاسمی نے ۴ دسمبر کو منتخب جنرل سکریٹری مولانا محمد شفیع مونس کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ جس میں انتہائی خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے موصوف نے مولانا محترم کو مشورہ دیا ہے کہ جو بے ضابطگی ہو چکی ہے اس کے لئے جواز فراہم کرلیا جائے۔ موصوف نے لکھا ہے۔ "ارکان کی مکمل فہرست مع نوٹس بھیج رہا ہوں۔ جن کی تحریری منظوری حاصل فرمالیں تاکہ جو بے ضابطگی ہو چکی ہے اس کے لئے اب جواز فراہم کرلیا جائے۔" (قاسمی صاحب کے خط کی فوٹو کاپی اس صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

مولانا قاسمی صاحب نے منتخب جنرل سکریٹری کو جس بے ضابطگی کا جواز فراہم کرنے کا مخلصانہ مشورہ دیا ہے اس کا تعلق دراصل ممتاز افراد اور جماعتوں کے ارکان کی نامزدگی سے ہے۔ اب تک کی روایت یہ رہی ہے کہ پہلے ۳۰ ممتاز افراد کی فہرست تیار کی جاتی ہے جسے بنیادی ارکان اور عاملہ اپنی منظوری دیتی ہے۔ بعد ازاں ان لوگوں سے ان کی تحریری منظوری حاصل کی جاتی ہے اور یہ تحریری منظوری حاصل کرنے کے بعد ہی انہیں مجلس مشاورت کی جنرل باڈی کا رکن تصور کرلیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کل ہند اور صوبائی سطح کی جماعتوں کی بھی تحریری منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو جماعتیں تحریری طور پر مشاورت کی رکنیت قبول کرلیتی ہیں وہ اگر کل ہند سطح کی ہیں تو پانچ اور صوبائی سطح کی ہیں تو اپنے دو افراد نامزد کرکے مرکزی دفتر کو اس کی اطلاع دے دیتی ہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہونا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

اس بار ۲۱ ممتاز افراد نے تحریری طور پر اپنی منظوری تو دی تھی لیکن لکھنؤ کے انتخابی اجلاس میں صرف ۱۰ لوگ ہی شریک ہوئے۔ اسی طرح جماعتوں کے نمائندہ افراد کی مجموعی تعداد ۳۰ تھی لیکن شریک اجلاس صرف ۱۱ افراد ہی ہوئے ۱۹ غیر حاضر رہے۔ مشاورت کے بنیادی ارکان کی تعداد گیارہ ہے۔ لیکن ان میں سے بھی صرف تین افراد مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی، ذوالفقار اللہ (صدر) اور سید شہاب الدین اجلاس میں شریک ہوئے باقی آٹھ غیر حاضر رہے۔ یہ تعداد کورم پورا کرنے کے لئے کافی نہیں تھی چنانچہ ۸ ایسے افراد کو جن کی پہلے سے منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی بروقت ممبر بنایا گیا اور ان لوگوں نے انتخاب میں حصہ بھی لیا۔ ان میں

Ahmad Ali Quasmi
General Secretary:
ALL INDIA MUSLIM MAJLIS-E-MUSHAWARAT
Editor: DAWAT-O-AZEEMAT (URDU)
Ref. No.................

احمد علی قاسمی
جنرل سکریٹری کل ہند مسلم مجلس مشاورت

435, MATIA MAHAL, JAMA MASJID, DELHI-110006 Phone: Office 3322977 - Resi. 3264569

پروفیسر عبدالمغنی، جناب سید حامد، جناب او عبدالرحمن، جناب ابراہیم شیخ، جناب عبدالقدیر ایڈوکیٹ، جناب عزیز احمد حیدرآباد اور جناب پرواز رحمانی کے نام شامل ہیں۔ یہ لسٹ کسی اور نے نہیں بلکہ خود مولانا احمد علی قاسمی صاحب نے مولانا محمد شفیع مونس صاحب کو بھیجی ہے۔ اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش اس لئے نہیں ہو سکتی کہ لکھنؤ کی انتخابی میٹنگ سے قبل تک مرکزی دفتر کی ذمہ داریاں انہیں کے پاس تھیں اور بحیثیت جنرل سکریٹری وہی خط و کتابت بھی کر رہے تھے اور انہیں ہی ان لوگوں کی باضابطہ طور پر فہرست بھی مرتب کرنی تھی جنہوں نے تحریری طور پر مجلس کی رکنیت اختیار کرنے کی منظوری دے دی تھی۔ مولانا احمد علی قاسمی صاحب نے مولانا محمد شفیع مونس صاحب کو اپنے خط کے ساتھ جو نوٹس بھیجے تھے ان میں ایک نوٹ کا تعلق مختلف موجود یا معدوم تنظیموں کے ان بارہ افراد سے بھی ہے جن کی دفتر کو تحریری منظوری موصول نہیں ہوئی تھی اور بقول مولانا قاسمی "مرکزی دفتر کو ان کے ناموں تک کا بھی پتہ نہیں تھا۔" یہ لوگ بھی انتخابی اجلاس میں شریک ہوئے اور اپنے طور پر ووٹ بھی ڈالے۔ یہ بھی مولانا قاسمی کے بقول بے ضابطگی کا ایک واضح نمونہ ہے اور منتخب جنرل سکریٹری صاحب کو جن بے ضابطگیوں کا جواز فراہم کرنا ہے ان میں سے ایک بے ضابطگی یہ بھی ہے۔

مولانا احمد علی قاسمی نے مولانا محمد شفیع مونس صاحب کے نام اپنے مکتوب گرامی میں اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف بھی کیا ہے کہ مولانا محمد سالم صاحب کو ان کی غیر موجودگی میں صدر منتخب کیا گیا۔ جبکہ پہلے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ۱۹۹۰ء کے چناؤ میں سید شہاب الدین صاحب کا نام بطور نائب صدر پیش کیا گیا تو اس بنا پر ہی یہ تجویز نامنظور کردی گئی کہ وہ اجلاس میں موجود نہیں تھے۔ ۱۹۹۰ء میں جو چیز نادرست اور غیر آئینی تھی وہ ۱۹۹۵ء میں کس طرح درست اور آئین کے مطابق قرار پائی۔ اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی اس سے بھی بڑی بے ضابطگی اور مشاورت کے آئین کی بے حرمتی کا ارتکاب حضرت مولانا کلب صادق صاحب کو نائب صدر منتخب کرکے کیا گیا ہے۔ جو نہ تو اجلاس میں حاضر تھے اور نہ مشاورت کے رکن اب ہیں نہ پہلے کبھی رہے ہیں۔

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل نو اس بات کی مظہر ہے کہ مسلمانوں کی اس موقر تنظیم کی گاڑی کو پٹری پر لانے کی نہ صرف یہ کہ تمام تر توقعات خاک میں مل چکی ہیں بلکہ یہ حقیقت بھی بہت کھل کر سامنے آئی ہے کہ مسلمانوں کی تنظیموں کو اور ملت کے ممتاز افراد کو اب اس تنظیم پر قطعا کوئی اعتماد نہیں رہ گیا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس میں انڈین یونین مسلم لیگ، نیشنل لیگ، جمعیۃ علماء ہند، ملی جمعیۃ علماء، مرکزی جمعیۃ علماء، آل انڈیا ملی کونسل، ملی پارلیامنٹ، ایس آئی ایم، علماء کونسل، مشاورتی کونسل، تعمیر ملت، مجلس بچاؤ تحریک حیدرآباد، مسلم ماسٹارٹی فرنٹ آسام، عبدالناصر مدنی کی پی ڈی پی اور تحریک مسلم شبان وغیرہ نے مشاورت کے ساتھ کوئی رشتہ جوڑنا ضروری ہی نہیں سمجھا اور ان تنظیموں کو الگ کرکے کسی پلیٹ فارم یا ادارے کو مسلمانوں کا مشترکہ پلیٹ فارم کہنا حقائق کو منہ چڑانا ہی ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مشاورت اب اپنی پرچھائیں بھی نہیں رہ گئی ہے۔ مشاورت ہی کیا دوسری تمام تنظیمیں بھی جو اسلام اور مسلمانوں کے نام پر الگ الگ دوکانیں سجائے ہوئے ہیں ان پر مسلمانوں کو اب سرے سے کوئی اعتماد نہیں رہ گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے نہ کبھی دینی حمیت کا ثبوت دیا ہے اور نہ دینی حمیت کے لئے ان کے یہاں کوئی خانہ باقی بچا ہے۔ قلب یورپ میں واقع بوسنیا کے مسلمانوں پر جب قیامت صغری ٹوٹی تو انہوں نے اس کا نوٹس تک نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ جن باحمیت لوگوں نے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ بوسنیا کے مسلمانوں کا ساتھ دیں اور اس مقصد کے لئے انہیں وہاں تک پہنچانے کا بیڑہ بھی اٹھایا ان کا ان لوگوں نے مذاق اڑایا۔ ان کے لئے دین کی خدمت محض نعرہ ہے اور نعرے بہت دنوں تک لوگوں کو اپنے دام میں الجھائے نہیں رہ سکتے۔ مشاورت آج اپنی ساری اہمیت کھو چکی ہے کل ان تنظیموں کا بھی یہی حال ہونا ہے۔

•

بقیہ : بچوں کی تربیت

نظر ڈالی جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آج انسان نے اپنے لئے مادی ضروریات کی روشنی میں زندگی کے جو اصول وضع کئے ہیں وہ سب ناپختہ ہیں اور اس کی خام خیالی کی چغلی کھاتے ہیں۔

جب بچہ اچھی بری چیزوں میں تمیز کرنے لگتا ہے اور پھر اسکول کی شروعات سے لے کر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مدارج طے کرنے تک اسے اپنے ذہن کی وسعت کے مطابق دنیا کے مظاہر، انسانی برتاؤ اور اس کے رد عمل کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہیں سے وہ براہ راست حیات و کائنات اور خالق کائنات کے حقائق کو جاننے کی بھی معصومانہ کوشش کرتا ہے اور اس میں والدین سے اپنے فطری لگاؤ کی بناء پر سب سے زیادہ تعاون کی امید ان ہی سے ہی ہوتی ہے۔ جو والدین ان مراحل میں اپنے نونہالوں کی رہنمائی کے لئے خود کو تیار رکھتے ہیں وہ ان کی ذہنی نشو و نما مثبت انداز میں تو کرتے ہی ہیں ساتھ ہی وہ ان کے فطری جذبے کی بھی تسکین کرتے ہیں جو والدین بچے کو اپنے ساتھ نماز پڑھنا سکھاتے ہیں وہ بالفاظ دیگر اس کی رفاقت کا حق بھی ادا کرتے ہیں جو اس بچے کے لئے وقت کی ضرورت بھی ہے۔ یہی رفاقت و اعتماد کا رشتہ جب والدین کی غفلت سے ٹوٹ جاتا ہے تو بے شک آواز نہیں آتی لیکن معموم دل میں گرہ ضرور پڑ جاتی ہے۔ یہی بچہ جب عمر کی کچھ اور منزلیں طے کرلیتا ہے دل کی گرہ مزید الجھ جاتی ہے۔ احساس محرومی اس کے اندر بے زاری و بغاوت پیدا کرتا ہے۔ اس محرومی کا علاج وہ کبھی خود کو ایذا دے کر تو زیادہ تر دوسروں کو اذیت پہنچا کر کرنا چاہتا ہے۔ بچوں کے جرم کی دنیا اسی احساس محرومی اور ان کے والدین کی آسائش پسندی کی آئینہ دار ہے۔

•

بقیہ : — ملیشیا

ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور کوئی مجھے عہدہ صدارت کے لئے نامزد کرنے پر اپنا وقت ضائع نہ کرے"۔

انور کے مذکورہ ریمارک سے مہاتر بے انتہا متاثر ہوئے۔ چنانچہ اپنی جوابی تقریر میں انہوں نے کھل کر کہا کہ وہ بہت جلد اقتدار انور کو سونپ دیں گے۔ اگرچہ نومبر کی پارٹی کانفرنس نے انور اور ان کے حامیوں کی تحریک پر یہ تجویز پاس کردی ہے کہ مہاتر اور انور دونوں ہی ۱۹۹۹ء تک کے لئے بالترتیب پارٹی صدر و نائب صدر برقرار رہیں گے اور دونوں عہدوں کے لئے آئندہ سال پارٹی کانفرنس میں کوئی مقابلہ نہیں ہوگا جس کا مطلب ہے کہ مہاتر کم از کم ۱۹۹۹ء تک وزیر اعظم رہ سکتے ہیں لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ شاید وہ اس سے بہت قبل ملک و پارٹی کی قیادت انور کو سونپ دیں گے۔

بچوں سے دور رہ کر آپ ان کے ذہنوں میں انتشار کے بیج بو رہے ہیں

بچوں کی اخلاقی و دینی تربیت میں والدین کے کردار کی بہت اہمیت ہے

آج دنیا کے ہر گوشے میں بچوں کی تعلیم و تربیت، پرورش اور تغذیہ رسانی کے مختلف پہلوؤں پر خصوصی مطالعے، سروے، سیمنار اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ ان سرگرمیوں کی روشنی میں دیگر بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ یہ تیتجہ بھی سامنے آیا ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں خواہ وہ مغرب کا ہو یا مشرق کا خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی بھی مذہب و عقیدے اور اقدار سے ہو۔ بچوں اور نوعمروں میں اخلاقی بے راہ روی اور جرائم پسندی کا رجحان تیزی سے بڑھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں مدارج کا فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق گزشتہ دو دہائیوں کے مقابلے میں مجرم بچوں کی تعداد چار گنی تو ہو ہی چکی ہے۔

یہ یقینا ایسی ہوشربا تبدیلی ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرکے اس کا سد باب نہ کیا گیا تو آنے والی نسلوں کی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ زیر نظر سطور میں چند اہم زاویوں سے گفتگو کی جائے گی جو اس دور میں انسانی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

ہم اور آپ یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز ترقی اور دنیا کی نیرنگی میں وسعت کے ساتھ ساتھ انسان کی ضرورتیں بھی روٹی کپڑا اور مکان تک ہی محدود نہیں رہ گئی ہیں اور ضرورت و آسائش کے سابقہ معیار اپنی معنویت کھوتے جارہے ہیں۔ اب ہر شے ضرورت بن چکی ہے اس لئے ضروریات کی تکمیل میں تقدیم و تاخیر کے انتخاب کا کوئی سوال بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اس انتخابی عنصر کے خاتمہ کا ایک اثر تو سماجی اور خاندانی سطح پر یہ پڑا ہے کہ مشترک خاندان منقسم ہوگئے اور اس منقسم خاندان میں بھی ضروریات کی تکمیل بہتر اور معیاری طور پر کرنے کی کوشش میں ہر شخص کو کسب زر کا وسیلہ بنانے کا تصور جڑ پکڑنے لگا۔

اس طرح یہ بات اصولا تسلیم کرلی گئی کہ ضروریات زندگی بہت بڑھ گئی ہیں اور اشیاء کی قیمتیں بھی بہت ہو گئی ہیں۔ خاندان کے سربراہ کی آمدنی اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے ایک سے زیادہ کمانے والے ہونے چاہئیں۔ اس انداز فکر نے شہری زندگی کو خاص طور پر متاثر کیا۔

ازدواجی زندگی کے دو ماڈل سامنے آتے ہیں ایک متمول یا صنعت کار کا نمائندہ ہے اور دوسرا متوسط طبقے کا۔ اول الذکر طبقے سے تعلق رکھنے والے والدین کی گوناگوں، ذاتی، سماجی اور تفریحی مصروفیات بچوں کی طرف توجہ دینے سے روکتی ہیں۔ اور دوسرے طبقے میں شوہر بیوی دونوں ملازمت پیشہ ہیں یا اگر شوہر ملازم ہے تو بیوی بھی سرکاری یا نجی سیکٹر کے کسی ادارے میں ملازم ہے۔ آمدنی کی سطح کے مطابق ایک دو بچے، جیسی بھی صورت حال ہو، کسی دوسرے شہر کے معیاری اسکول کے ہوسٹل میں رہتے ہیں اور اگر گھر ہی پر رہتے ہیں تو زیادہ تر وقت ان بچوں کا آیا یا نوکر کے ساتھ گزرتا ہے۔ متوسط طبقے کے والدین مادی طور پر معیار زندگی بلند کرنے کی تگ و دو میں بچے پر وقت نہیں دے پاتے۔ بظاہر یہ زندگی بہت عیش و آرام سے گزرتی ہے اور یہ والدین خوش رہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کا مستقبل سنوار رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ والدین اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ وہ آیا یا نوکر یا صرف ٹیوٹر وغیرہ کی سہولتیں اپنے بچوں کے لئے پیدا کرکے اور خود کو آزادی و سکون فراہم کرکے انتشار کا بیج بھی بو رہے ہیں جو بچوں کے ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد رنگ لائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیسے سے مادی آسائشیں اور افراد کی محنت و خدمت تو خریدی جاسکتی ہے ایسی کوئی چیز نہیں خریدی جاسکتی جو بچوں کے لئے والدین کی محبت و شفقت کا نعم البدل ہو۔

مادی ترقی کی دوڑ نے ایک اور تصور دیا ہے اور وہ ہے انفرادی آزادی اور احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے مواقع کی فراہمی۔ یہ تصور کم عمر بچوں کو بلا روک ٹوک چھوڑ دینے کا حامی ہے تاکہ آزاد فضا میں ان کی ذہنی نشو و نما ہوسکے۔ گھر میں چھوٹے بچوں کے لئے بھی کمرے مخصوص کرنے کا رویہ اسی تصور کی ایک کڑی ہے۔ ہمعصر زندگی کے ان رویوں کے مثبت و منفی پہلوؤں پر

باقی صفحہ ۱۶ پر

بے شک خودکشی حرام ہے ــــ مگر

ایسی موت خودکشی نہیں اللہ کی راہ میں قربانی ہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال: ــ اسلام کسی کو خودکشی کی اجازت نہیں دیتا۔ کیا یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ جہاد کی تحریک میں شریک کفن بردوش بمباروں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے یا ان کا معاملہ مختلف ہے۔؟

جواب: ــ بے شک خودکشی حرام ہے کیونکہ اس سے حیات و موت کے اختیار الٰہی پر حرف آتا ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ تر لوگ اپنے حالات میں بہتری آنے کے امکانات کی طرف سے مایوس ہوکر خودکشی جیسا قدم اٹھاکر خود کو ہلاک کرلیتے ہیں۔ اس طرح خود کو موت کے حوالے کرنا اللہ تعالی کی عظمت و رحمت سے انکار کے مترادف ہے۔ کسی صاحب ایمان کا یہ رویہ نہیں ہوتا۔ جہاد یا اللہ کی راہ میں لڑنے کی صورت کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں اللہ کی رحمت کی طرف سے مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اگر جانباز تحریک میں شامل شخص پختہ ایمان کا مالک ہے تو وہ اللہ کی رحمت اور شہادت پر یقین کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے اعمال پر نظر کی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ اپنے مجاہد رفقاء کی فتح مندی کے لئے بھی اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ کبھی ایسا موقع آسکتا ہے کہ مسلم مجاہدین کا کوئی گروہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور مسلح فوج کے نرغے میں گھر جائے اور حالات ایسے بن جائیں کہ انجام کار سب کی موت یا گرفتاری سامنے نظر آرہی ہو۔ ان میں سے کوئی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن پر حملہ آور ہو اور اس کا یہ اقدام اس کے خیال میں ایسا ہو کہ باقی ساتھیوں کو بچ نکلنے، فتح مند ہونے یا تازہ مدد پہنچنے تک مقابلے پر جمے رہنے کا موقع فراہم کرے گا اور وہ مارا جائے تو یہ خودکشی نہیں ہوگی۔ یہ موت اللہ کی راہ میں قربانی کی حیثیت رکھتی ہے اور ایسے شخص کا یہ عمل مستحسن قرار پائے گا۔ کوئی معاہد ایسے اقدام کا فیصلہ کب کرے اس کا انحصار حالات اور اس اقدام کے نتائج کی اہمیت پر ہے۔ اللہ سب کی نیتوں کو جاننے والا ہے اور نیتوں کے مطابق وہ اس کا اجر بھی عطا کرے گا۔

سوال ــ: نماز پڑھتے وقت میرا ذہن ادھر ادھر بھٹک جاتا ہے۔ بہت کوشش کے باوجود بھی اس پریشانی پر قابو نہیں پاسکتا۔ اس کا کوئی طریقہ بتائیں۔؟

جواب ــ: یہ ایسی پریشانی ہے جس میں کسی نہ کسی حد تک تمام لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ بعض لوگ ضرور ایسے ہیں جو نماز پڑھتے وقت ہر حال میں اپنے خشوع و خضوع کو برقرار رکھتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو جب بھی نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو ان کا خیال رہ رہ کر بہک جاتا ہے۔ تاہم خشوع و خضوع اور ذہن بھٹکنے کے بھی مختلف درجات ہیں۔ کسی شخص کے ذاتی حالات کچھ بھی ہوں نماز پڑھنے کے دوران اسے چاہئے کہ جو کلمات زبان سے ادا کر رہا ہے ان پر پوری طرح دھیان دے۔

> شوہر کو ایسی حالت میں اپنی بیوی کو باور کرانا چاہئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ عورت اپنے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کے باقی حصوں کو چھپائے رکھے

تاہم یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ نماز میں خیال کے بھکنے اور اس کے تیتجے کی طرف سے کبھی مایوسی کا شکار ہوکر نماز ترک کرنی نہیں چاہئے۔ کوشش کرکے دیکھیں اور اگر برائے نام بھی فرق واقع ہوتا ہے تو یہ تبدیلی لائق مسرت و اطمینان ہے۔ نیز یہ کہ خشوع و خضوع کی کیفیت میں اتار چڑھاؤ آنا عین فطری بات ہے۔ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ نماز پڑھنے والے کو اپنے بھکے ہوئے خیالات پر قابو پانے میں خاصی کامیابی مل جائے اور پھر اچانک پہلے جیسی حالت کی طرف طبیعت لوٹنے لگے اور توجہ پر گرفت ڈھیلی ہونے لگے۔ ایسی صورت میں سوچنے کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ آپ ایک بار کامیاب ہوچکے ہیں تو دوسری بار کسی اور موقع پر کوئی وجہ نہیں کہ ناکام ہوجائیں۔ درمیانی ناکامی کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں جو حالات پر غور کرنے سے سامنے آئیں گی ممکن ہے کہ اس کی وجہ بعض وقتی پریشانیاں اور تفکرات ہوں۔ یہ تفکرات بھی عبادات میں جی لگاکر دور کی جاسکتی ہیں اور بہتر خشوع و خضوع پیدا کرنے کی راہیں بھی نکالی جاسکتی ہیں۔

سوال ــ: اگر باہر نکلتے ہوئے کوئی عورت سر پر اسکارف نہ باندھے تو اس کے اس عمل کے لئے شوہر کس حد تک ذمہ دار ہے۔ عورت کا کہنا یہ ہے کہ اس کے خاندان یا حلقہ احباب میں کوئی عورت سر نہیں ڈھکتی۔ اسلامی حکم کی خلاف ورزی کے لئے اس کا شوہر کہاں تک قابل مواخذہ ہے؟

جواب: ــ اسلامی فرائض کی انجام دہی میں مرد اور عورت دونوں کی ذمہ داریاں یکساں ہیں اس میں ایک دوسرے پر کسی دباؤ کی گنجائش نہیں۔ دونوں کے درمیان خواہ کوئی بھی رشتہ ہو۔ دیکھنا کسی ایک کی ذمہ داری نہیں کہ دوسرا اسلامی احکام پر کس حد تک کاربند ہے۔ بنیادی اسلامی اصول ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اسی لئے اللہ کی اطاعت پر ایک دوسرے کو مجبور نہ کریں کیوں کہ جب یہ اطاعت کوئی شوہر اپنی بیوی پر مسلط کرتا ہے تو اس کی معنویت ختم ہوجاتی ہے۔ جو عورت غیر اسلامی لباس میں باہر نکلنا چاہتی ہے اس کے شوہر کو اس پر زور زبردستی سے احتراز کرنا چاہئے کیونکہ جب وہ زبردستی کا عنصر ختم ہوجائے گا تو وہ پھر آزادی کی روش اختیار کرے گی گویا کہ اس کی شعائر دینی کی اطاعت اللہ کے حکم کی تعمیل میں نہیں بلکہ شوہر کی ناراضگی کے خوف سے تھی۔ شوہر کو ایسی حالت میں اپنی بیوی کو باور کرانا چاہئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے کہ عورت اپنے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کے باقی حصوں کو چھپائے رکھے اور اس حکم سے کوتاہی پر اللہ ہی اس سے مواخذہ کرے گا نہ کہ کوئی اور انسان یا شوہر۔ زیر نظر معاملے میں صبر اور سمجھ کی ضرورت ہے۔ اگر اس عورت کے ملک میں مناسب اسلامی لباس کا رواج نہیں ہے تو اس کی اہمیت اس پر واضح کی جائے اور اسے باور کرایا جائے کہ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے نہ کہ شوہر کی طرف سے اور جب اس میں یقین پیدا ہوجائے گا تو اس کا رد عمل مختلف ہوگا۔

آپ اپنے بچوں کو دواؤں پر زندہ رکھتے ہیں

خبردار بچوں کو دواؤں کا محتاج نہ بنائیں

بچوں کے کسی عارضے کے علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس پہنچنے والے متفکر والدین کو اکثر کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ "ہمارا بچہ ٹھیک سے کھاتا نہیں ہے۔ اسے کوئی وٹامن یا بھوک کھولنے کی دوا دیجئے"۔ یہ رجحان بچوں کو دوا کے سہارے پر رکھنے کے موجودہ رواج کی عکاسی کرتا ہے۔ عموماً والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کی صحت کی حالت میں جب بھی کوئی حقیقی یا خیالی خلل واقع ہو تو فوراً اسے دوا کے ذریعہ دور کردیا جائے۔ یہ خیال کئے بغیر کہ تمام دوائیں اپنی اصل کے اعتبار سے نقصان دہ ہوتی ہیں اور اس سے نقصان کے خطرہ کا امکان بچوں کو زیادہ ہی رہتا ہے۔

عالمی تنظیم صحت کی ایک رپورٹ شاہد ہے کہ دنیا بھر میں بچوں کو استعمال کرائی جانے والی ادویات کا ایک تہائی حصہ ضائع ہوتا ہے۔ شفاخانوں کے شعبہ اطفال میں زیر علاج رہنے والے مریضوں میں سے اکثریت ایسوں کی ہوتی ہے جو کسی دوا کے غلط اثرات کے نتیجے میں بیمار پڑجاتے ہیں۔ دواؤں کے مضر اثرات کے سب سے زیادہ نشانہ بچے ہی اس لئے بنتے ہیں کہ بچوں کے گردے اور پھیپھڑے ارتقائی مرحلے میں ہوتے ہیں اس لئے وہ جلد اثر قبول کرتے ہیں

اور ان حصوں سے ادویاتی اجزاء کا اخراج خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے بچوں کے لئے دوا کی مقدار کی ناپ بڑی احتیاط سے کرنی ہوتی ہے اور اس کام میں عمر اور وزن دونوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس احتیاط سے جہاں توجہ ہٹی بچہ کو ضرورت سے زیادہ دوا مل جاتی ہے۔

بچوں میں زیادتی دوا کے خطرات میں اضافہ عام طور پر بکنے والی ان ادویات سے بھی ہوجاتا ہے جو بچوں کو ہلکی کھانسی نزلہ یا ہیضہ سے ملتی جلتی کیفیت میں دی جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بچوں میں اس طرح کے عوارض رونما ہونے کے بعد چند دن میں اپنے آپ ختم ہوجاتے ہیں اور ان کے لئے کسی دوا کی ضرورت شاید ہی پڑتی ہے۔ ان میں سے بیشتر کا سبب وائرس یا خورد بینی کیڑے ہوتے ہیں جن پر ان ادویات کا کوئی اثر پڑتا نہیں ہے تاوقتیکہ وہ اپنی مدت حیات پوری کرکے خود ہی ختم نہ ہوجائیں۔ تاہم صورت حال کو خراب تر کرنے میں بڑے پیمانے پر اینٹی بائیوٹک دواؤں کے استعمال کا خاصا ہاتھ رہا ہے۔ اسی طرح زیادہ تر حالات میں یہ طے ہوتا ہے کہ بچوں کے نزلہ اور کھانسی کا سبب وائرس ہیں لیکن پھر بھی بلاوجہ انہیں اینٹی بائیوٹک دوائیں دے دی جاتی ہیں۔

نزلہ اور زکام کی عام طور پر دستیاب دواؤں میں ہسٹامنک عناصر کی آمیزش ہوتی ہے جو مریض پر مسکن اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس تاثر کے اظہار کے لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ پیکنگ پر اشتہار ہوتا ہے کسی سکون سے سوئے ہوئے بچے کا اور ماں اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اس اشتہار کا ظاہری پیغام یہ ہوتا ہے کہ شفیق مائیں اپنے بچوں کا دھیان رکھتی ہیں اور ان کی ہر تکلیف میں دوا دیتی ہیں۔ جب کہ پوشیدہ مفہوم اس تصویر کا یہ ہے کہ بچے کو سلاکر ماں کسی حد تک اطمینان و سکون حاصل کرسکتی ہے۔ لیکن ان دواؤں کے مضر اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو اعصاب کی کمزوری، عدم توازن یا عضلاتی کوآرڈی نیشن کے فقدان کی صورت میں رونما ہوسکتے ہیں۔ نزلہ میں دی جانے والی دواؤں میں اکثر نیم الیفیڈرین اجزاء کی آمیزش ہوتی ہے تاکہ ناک میں رطوبت کو جمنے سے روکا جائے۔ یہ تو ہوجاتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ بچے میں بے خوابی کی شکایت بار بار پیدا ہوگی یا نیند کی حالت میں ڈر کر چونکنے لگے گا۔

بعض دفعہ ایسا ہوجاتا ہے کہ بچے کو بخار ہے تو اسے آناً فاناً اتارنے کی خاطر بے تحاشا دوائیں دی جانے لگتی ہیں۔ لیکن اس بات کے بھی ثبوت ملے ہیں کہ مصنوعی طریقوں سے بخار نیچے لانے کے نتیجے میں بچے کے جسم کا امیون سسٹم بخار پیدا کرنے والے وائرسوں سے نبرد آزمائی کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔

وٹامن اور بڑھوتری میں مدد دینے والی دواؤں کا بھی بے جا استعمال ہوتا ہے۔ پہلی غلط فہمی تو والدین کو اس سلسلے میں یہ رہتی ہے کہ بعض ٹانکوں کے استعمال سے بچے کا جسم مضبوط ہوگا اور اس کی ذہانت میں بھی شاید اضافہ ہوگا۔ حالانکہ انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ تغذیہ بخش اور متوازن خوراک کی جگہ کوئی ٹانک نہیں لے سکتا ایک اور زمرے کی دوا جو بچوں کے لئے عام طور پر تجویز کی جاتی ہے Psychrtropic Drugs ہیں جو بچوں کو دوران خواب لاحق عارضوں میں دی جاتی ہیں جب کہ اس ضمن میں یہ جاننا ضروری ہے کہ جو بچہ نیند میں پیشاب کردیتا ہے وہ غیر شعوری طور پر گھر یا اسکول میں والدین اور اساتذہ کی بہتر توجہ کا طالب ہے۔ اس امکان پر توجہ نہ دے کر جو معالجین، سیدھے دوا پر ہاتھ ڈالتے ہیں وہ اپنی ذمہ داری گویا بچہ کی طرف منتقل کرتے ہیں۔

جدید طب میں برکتیں بھی ہیں اور زحمتیں بھی

اس ترقی یافتہ دور میں ادویات پر سے انسانوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے

سائنس اور ٹکنالوجی کے شانہ بہ شانہ جدید طب نے بھی حیرت انگیز طور پر ترقی کرلی ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں میں تشخیص امراض، ڈزائنر ڈرگ اور دیگر انسدادی تدبیروں کی ایجاد میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک وقت تھا جب کارونری آرٹری کے عارضے کا کوئی علاج نہیں تھا بلکہ اس کا تصور دینے والا شخص جان ہنٹر بغیر علاج کے چند سکنڈوں میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لیکن آج یہ ممکن ہوگیا کہ صحیح طور پر کارونری آرٹری میں کسی رکاوٹ کا پتہ چلاکر اس کی سرجری کی جاسکے۔ آپریشن اور تدخیر یا انستھیسیا کی سہولتوں سے رحم مادر کے اندر پلتے ہوئے بچے پر بھی زندگی بچاؤ سرجری انجام دی جاسکتی ہے۔ چیچک جیسی مہلک متعدد بیماریوں کا کرہ ارض سے صفایا کیا ہی جاچکا ہے اور دیگر وبائی امراض کو بھی قابل علاج بنالیا گیا ہے۔ ترقی کا یہ عالم ہے کہ آج ہزاروں معذور و اپاہج افراد عزت و وقار کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دائمی امراض کے اصول کی بہتر تفہیم کی مدد سے بلند فشار خون ہیپٹک السر، ذیابیطس، دمہ اور مرگی جیسے امراض کے طریقہ علاج میں انقلاب برپا ہوچکا ہے۔

ان تمام ترقیوں کے باوجود یہ تکلیف دہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس دوران دواؤں پر سے انسان کی بے اطمینانی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس گتھی کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ سائنسی ترقی سے کہیں زیادہ اہم ہے
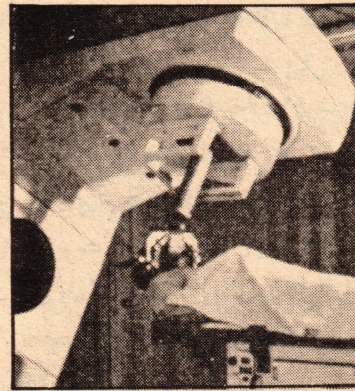
Humanistic Medicene کی ترقی جو مریض اور معالج کے رشتے کو زیادہ مستحکم بناکر ان دونوں کے درمیان اعتماد کی فضا قائم کرتی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ۱۹۸۴ء میں امریکہ میں شائع ہونے والی ایک طبی رپورٹ میں اس نکتے پر زور دیا گیا تھا کہ ڈاکٹروں کو میڈیکل کالج میں ہیومنیٹک میڈیسن کی باقاعدہ تربیت دی جائے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ صحت سے متعلق ۹۰ فیصد مسائل معمولی نوعیت کے یا اپنی میعاد پر معمول پر آجانے والے ہوتے ہیں۔ جن کے لئے ضرورت ہوتی ہے خاندانی طبی مشیر کی اور اگر وہ بھی دستیاب نہ ہو تو بستی کے طبی مشیر یہ کام انجام دے سکتے ہیں اس طرح مخصوص طبی میدانوں میں کام کرنے والے افراد کا بہت سا وقت بچایا جاسکتا ہے۔

طبی دیکھ بھال کی تاثیر کا معاملہ ابھی تک خاصا پراسرار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق معالج کے ۲۰ فیصد معاملات ہی سائنسی طب سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً سنگین تعدد کی صورت میں اینٹی بائیوٹک یا زندگی بچاؤ سرجری کا عمل۔ یہ ایک عام خیال ہے کہ باقی ۸۰ فیصد معالجے یا اندمال کا تعلق مختلف طرح کے عقائد پر ہے۔ شفایابی میں کسی مریض کا عقیدہ پچیس فیصد تک دخیل ہوتا ہے۔ کسی خاص دوا یا طریقہ علاج میں مریض کے عقیدہ کا دخل ۳۵ فیصد سمجھا گیا ہے اور شفایابی کے بقیہ حصے کا تعلق مریض کے خدا پر اعتقاد سے ہے۔ عقیدہ و یقین کے معاملات ابھی تک زیادہ تر انسانی سمجھ سے باہر ہیں۔

اگر آج کے ہسپتالوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا

> طبی دیکھ بھال کی تاثیر کا معاملہ ابھی تک خاصا پراسرار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق معالج کے ۲۰ فیصد معاملات ہی سائنسی طب سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً سنگین تعداد کی صورت میں اینٹی بائیوٹک یا زندگی بچاؤ سرجری کا عمل

ہے کہ وہ جسموں کی دوکان ہیں جہاں مریضوں سے بے جان اشیاء جیسا سلوک ہوتا ہے گویا کہ انسان نہ ہوا کوئی بے جان مشین ہوگئی جس کو دوبارہ قابل عمل بنانے کے لئے اس کے خراب پرزے کی مرمت کی جارہی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنی عقلی حدود میں بیس فیصد طبی خدمات انجام دیتے ہیں اور ۸۰ فیصد غیر عقلی پہلوؤں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض معالج سادہ لوح مریضوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔

مذکورہ عوامل کو سامنے رکھ کر Hippocrats نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کون سا عارضہ کس طرح کے آدمی کو لاحق ہوا ہے نہ یہ کہ کس آدمی کو کس طرح کا مرض لاحق ہوا ہے۔" آج ضرورت ہے کہ عقیدہ پر مبنی شفایابی کے عمل کے پیچیدہ پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹروں کی مصنوعی تربیت دی جائے۔ اور اس پہلو کو عقلی طبی سائنس کے احاطے میں شامل کیا جائے۔ اگرچہ شفایابی کے عوامل کی پراسراریت کو ختم تو نہیں کیا جاسکے گا لیکن طبی سائنس کو انسانیت پرستی سے روشناس کرانے کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہی وہ عنصر ہے جو مریض میں ڈاکٹر کی طرف سے اعتماد پیدا کرتا ہے اور اسے ڈاکٹر کی طرف رخ کرنے پر آمادہ کرتا ہے جہاں مریض کوئی صارف نہیں ہوتا بلکہ معاون بن جاتا ہے۔ یہی وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے مریض کو باور کرایا جاتا ہے کہ صحت اشیاء صرف میں سے کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ایک کیفیت ہے جس تک کوئی شخص اپنی کوشش کے بوتے پر ایک طبی پیشہ ور کے مشورہ کی مدد سے رسائی حاصل کرتا ہے۔

نئی کتاب

عوام کے دکھ درد کو فراموش کرکے لندن اور کشمیر کے بیچ سفر کرنے والا

ایک "فرض شناس باپ کا شاہ خرچ بیٹا"

ملی ٹائمز میں تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں۔ تبصرے کے لئے کتابوں کے انتخاب کا حتمی فیصلہ ادارہ کرے گا۔ البتہ وصول ہونے والی کتابوں کا اندراج ان کالموں میں ضرور ہوگا۔ (ادارہ)

نام کتاب: Farooq Abdullah: Kashmir,s Prodigal Son

(فاروق عبداللہ کشمیر کا شاہ خرچ بیٹا)

مصنف: آدتیہ سنہا

ناشر: یو پی ایس پی ڈی، قیمت ۲۵۰ روپے

مبصر: اجیت بھٹاچارجی

کتاب کے سرورق پر فاروق عبداللہ کی رنگین تصویر اور اس کے اجراء کے وقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر انہیں دوبارہ لانے کی تحریک کے دائرہ کار میں یہ سوانح لکھی گئی ہے۔ کتاب میں یقیناً فاروق عبداللہ سے ہمدردی کا عنصر ملتا ہے لیکن یہ تنقید سے خالی بھی نہیں ہے۔ اور آخر میں قاری خود کو اس کشمکش میں پاتا ہے کہ کیا کسی ریاست کا انتظام حکومت فاروق عبداللہ جیسے شخص کے ہاتھ میں سونپا جاسکتا ہے۔ کشمیر میں فاروق کے خود پسندانہ کردار کی وضاحت کے لئے ان کی ذاتی اور سیاسی زندگی سے متعلق وافر معلومات دی گئی ہیں۔ زیادہ تر معلومات خود فاروق عبداللہ سے حاصل کی گئی ہیں لیکن ایسی بھی ہیں جن کے ماخذ کا کوئی ذکر نہیں اور کتاب حواشی و حوالہ جات سے یکسر خالی ہے اور یہ طریقہ کار سوانح نگاری کے ذمہ دارانہ عمل کے لئے موزوں نہیں ہے۔ انداز بیان سے بھی عجلت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔

تاہم ہر اس شخص کے لئے جو ایک ایسے لیڈر کے ارتقاء جس پر بہت سی باتوں کا دارومدار اور کشمیر اور دہلی کے درمیان اس کے سیاسی دائرہ اثر کا اندازہ لگانے کی خواہش رکھتا ہو یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ شیخ عبداللہ سے ورثہ میں ملی ہوئی کشمیری سیاست اور مرکز سے اس کی اذیت ناک رشتے پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ کتاب میں فاروق کو پیدائشی لیڈر کی حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کے لڑکپن کے واقعات کے حوالے سے فرض شناس باپ اور آسان طلب بیٹے کا تضاد واضح کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سری نگر میں طالب علمی کے دوران فاروق کا پڑھنے سے جی چرانا اور پھر جے پور کے میڈیکل کالج میں زیر تعلیم رہنے کے دوران طلباء کی تعارفی تقریب میں "رگڑائی" کے خوف سے نہرو خاندان کے پاس دہلی بھاگ آنا۔ شیخ عبداللہ حالانکہ جیل میں تھے جواہر لال نہرو اس وقت بھی ان کے خاندان سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے انہوں نے فاروق کو سمجھا بجھا کر جے پور واپس کیا۔ وزیر اعظم کی طرف سے اس مشفقانہ برتاؤ نے مشکل وقت میں بھی ہندوستان سے ان کے ربط کو مزید مستحکم کردیا پھر بھی فاروق ۱۹۶۵ء میں انگلینڈ جانے سے باز نہ آئے جہاں انہوں نے ایک معمولی ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ وہاں ایک نرس سولی پچر سے ان کا ربط بڑھا جس سے انہوں نے شادی کرلی اور فاروق اور کشمیر کے درمیان مزید فاصلہ پیدا ہوگیا۔ شیخ عبداللہ ان کے اس اقدام سے بہت نالاں تھے۔

اس وقت فاروق سیاست سے قطعاً نابلد تھے۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران انہوں نے مقبوضہ کشمیر کا سفر کیا تھا جہاں جے کے ایل ایف کے صدر امان اللہ خاں نے کئی مقامات کی سیر کرائی۔ میر پور کے ایک کنونشن میں انہوں نے مبہم طور

باقی ص۱۳ پر

آپ کی الجھنیں

"وہ بڑی بڑی قسمیں کھاتی ہے مگر دل کہتا ہے کہ طلاق دیدوں"

اگر آپ کسی الجھن میں مبتلا ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ (ادارہ)

سوال:۔ کچھ دن قبل میری شادی ہوئی۔ ایک دن اچانک مجھ پر یہ راز کھلا کہ میری بیوی ٹیلی فون پر کسی سے خوب چہک کر باتیں کر رہی ہے۔ ایک روز میں اپنے کام سے ذرا جلد لوٹ آیا تو میری بیوی گھر پر نہیں تھی اور تقریباً نصف گھنٹے کے بعد وہ واپس آئی میں نے پوچھا کہ کہاں تھی تو جواب ملا کہ یونیورسٹی میں کیونکہ وہ جزوقتی طالبہ ہے۔ میرے اس سوال پر کہ وہ کس کے ساتھ گئی تھی اس نے بتایا کہ اپنے بھائی کے ساتھ۔ اس کے بھائی سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ تو اس کے ساتھ یونیورسٹی گیا ہی نہیں تھا۔ آخر بیوی نے اقرار کرلیا کہ وہ یونیورسٹی اکیلے ہی گئی تھی۔ پھر مجھے اس کی الماری میں ایک نوجوان کی تصویر ملی اور بیوی نے یہ تسلیم کیا کہ اس نوجوان سے اس کے مراسم کافی دن سے تھے جس کی ہوا اس نے کسی کو لگنے نہیں دی۔ میں نے اس بات کی اطلاع بیوی کے والد کو دی جنہوں نے اسے زدوکوب کرکے گھر میں بند کردیا۔ مجھے اپنے معاملے پر سخت افسوس اور حیرت ہے۔ جہاں تک اس کے گھر والوں کا تعلق ہے وہ بہت ہی نیک اور خوش اخلاق ہیں۔ بیوی بڑی بڑی قسمیں کھا کر توبہ کر رہی ہے کہ اب وہ غلط راستے کی طرف کبھی نہیں جائے گی اور میرا دل ہے کہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تو ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے اور مجھے ڈر ہے کہ بچہ ہوجانے کے بعد بھی اس کی روش یہی رہی تو اس پریشانی میں اور اضافہ ہوجائے گا۔ کبھی یہ بھی خیال آتا ہے کہ صبر کیا جائے اور حالات پر سنجیدگی سے غور و خوض کرتے ہوئے توبہ کو نبھانے میں اس عورت کی مدد کی جائے۔ ممکن ہے کہ اللہ اس کی توبہ کو قبول کرتے ہوئے راہ راست پر لگادے۔ میں اس معاملے میں آپ سے مشورے کا طالب ہوں؟۔

جواب:۔ ازدواجی خیانت سب سے بڑی مصیبت ہے جس میں بہت سے خاندان مبتلا نظر آتے ہیں خواہ اس خیانت کا ارتکاب شوہر کی طرف سے ہو یا بیوی کی طرف سے۔ ایک غیور مسلمان کو چاہئے کہ ایسے تمام دروازوں کو بند کردے جس سے فتنہ و فساد کے در آنے کا اندیشہ ہو۔ کسی شاعر نے حسب حال کہا ہے کہ جو چرواہا اپنی بھیڑوں کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے وہ بھیڑیوں کا لقمہ بن جاتی ہیں۔

بعض خاندانوں میں جو فسادات رونما ہوتے ہیں ان کا بڑا سبب حدود اللہ کی طرف سے ان کا تساہل ہے کیونکہ باپ اور بھائی اپنی بیٹی اور بہن کی نگہداشت کی ذمہ داری سے چشم پوشی کے نت نئے بہانے ڈھونڈتے ہیں مثلاً روشن خیالی اور شخصی آزادی وغیرہ۔ تو ہوتا یہ ہے کہ یہ بہن بیٹیاں جب چاہے باہر جاتی ہیں اور جس سے چاہے ملتی جلتی ہیں یہاں تک کہ بغیر محرم کے سفر بھی کرتی ہیں۔ حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہیں رہتا مگر یہ کہ شیطان ان کے درمیان موجود رہتا ہے۔ اور جب کوئی شرمناک واقعہ ہوجاتا ہے تو انہیں خود پر غصہ اور ندامت ہوتی ہے۔ اگر لوگ شریعت کے طریقے پر کاربند رہیں تو خود کو اپنے اہل خانہ کو مفسدات سے بچائے رکھیں گے۔ اور جو شخص حدود اللہ کی پابندی کرتا ہے اللہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان ایسی ہی کسی پریشانی میں مبتلا ہوجائے جیسا کہ مثال بالا میں مذکور ہوا اگر خیانت اور بے حیائی کی لت کے اس عورت کو پڑنے کا یقین ہے تو اسے طلاق دینا واجب ہے کیونکہ ایسی عورت کا ساتھ فحاشی اور رذالت کو بڑھاوا دے گا اور ایسے اعمال کے مرتکب شخص پر اللہ نے جنت حرام کردی ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کی عورت صدق دل سے نادم ہے اپنے کئے پر اور توبہ کر رہی ہے اللہ کے احکام کو پیروی کا وعدہ کر رہی ہے تو اس کو روکے رہنا جائز ہے۔ جو کچھ اس سے سرزد ہوگیا اس کی پردہ پوشی کی جائے اور توبہ پر قائم رہنے میں اس کی مدد کی جائے اور جو حالات مذکور ہوئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوان اور لاعلمی کی لغزش تھی اور جیسا کہ عورت کے گھر والوں کے حسن اخلاق کا حوالہ دیا گیا ہے تو اس معاملہ میں صبر کرنا احسن ہے اور شوہر کو چاہئے کہ اپنے گھر میں ایسا ماحول پیدا کرے جس سے نیکی کی طرف اس عورت کا دل مائل ہو اور منکرات کی طرف سے بے رغبتی پیدا ہو اور اس میں نماز کی پابندی بہت بڑا کام کرے گی کیونکہ نماز برائیوں سے روکتی ہے۔

سوال:۔ میں اٹھارہ برس کا ایک لڑکا ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ جب میں کسی لڑکی کو دیکھتا ہوں میرے دل میں برے خیالات آجاتے ہیں)۔ اس سے بچنے کا سہل طریقہ آپ بتایئے؟۔

جواب:۔ اگر آپ یہ بھی لکھ دیتے کہ کس چیز کو دیکھ کر آپ کے دل میں اچھے خیالات آتے ہیں تو بہتر ہوتا۔ یہ شرط لگا کر کہ کوئی سہل طریقہ بتایئے آپ نے خاصی مشکل میں ہمیں ڈال دیا ہے۔ اتنی بری عادت چھڑانے کے لئے طریقہ بھی ظاہر ہے کہ آسان نہیں ہوگا۔ ویسے آپ کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ انسانی ذہن خالی کبھی نہیں رہتا کسی نہ کسی طرح کا خیال اس میں ہر وقت آتا رہے گا ایک باہوش انسان اور عقل و ہوش سے محروم انسان میں فرق یہی ہے کہ اول الذکر ان خیالات میں اپنے ذہن کو الجھاتا نہیں ہے جو اس کی ذہنی و جسمانی صحت اور عام زندگی پر برا اثر ڈالیں۔ ماشاء اللہ آپ نوجوان ہیں زندگی میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کے انداز تحریر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کو پڑھنے لکھنے میں زیادہ وقت لگانا چاہئے۔ اس کالم کے پہلے استفسار کو بھی غور سے پڑھئے اور احکام الٰہی کو سمجھ کر ان پر عمل کریں انشاء اللہ نیک توفیق حاصل ہوگی اور دل میں صفائی پیدا ہوگی۔ ملی ٹائمز کا دفتر جس علاقے میں واقع ہے اسے "ابوالفضل انکلیو" کہتے ہیں۔ شاید آپ نے ابوالفضل صاحب کو اخبار کا ایڈیٹر سمجھ لیا۔

Invitation Price Rs. 5/-
1 - 15 JANUARY 1996
Volume : 2, Issue : 25

The Milli Times International
49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018
Fax: (011) 6926030

R.N.I. No. 57337/94
RGD DL No.-11234/96

مبلغ اسلام تک

۱۹۷۰ء کی دہائی میں برطانیہ کے موسیقی کے منظرنامے پر کیٹس اسٹیون کا نام جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ وہ خود ہی اپنے گانے تحریر کرتے اور پھر اپنی سحر انگیز آواز میں گاکر ایک عالم کو مدہوش سا کردیتے۔ ان کا ایک گانا Oh,baby it's a Wild World تو خاص طور سے بہت مشہور ہوا تھا۔ آج بھی یہ مصرعہ اسٹیون کی جادو بھری آواز میں کیسٹ کے ذریعہ لاکھوں دلوں کو گرمی پہنچا رہا ہے۔ اس گانے کا مرکزی مضمون ایک نوجوان لڑکی ہے جو اپنے عاشق کو چھوڑ کر جارہی ہے۔ غم زدہ عاشق اسے اچھے دنوں کی دعا دے کر اسے خبردار کرتا ہے کہ باہر کی دنیا پھولوں کی سیج نہیں ہے بلکہ وہاں بہت سارے مسائل اور خواہشات ہیں جو تمہاری زندگی کو اجیرن بنا سکتے ہیں۔

اس گانے کے کچھ ہی دنوں بعد اسٹیون نے محسوس کیا کہ دنیا جہاں کی دولت اور شہرت کے باوجود خود ان کی اپنی زندگی بہت کھوکھلی سی ہے۔ اس وقت اسٹیون شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ ان کے کئی البم دھوم مچائے ہوئے تھے۔ خاص طور سے Moon Shadon نامی البم کی ۲۵ ملین سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوچکی تھیں۔ برطانیہ ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی لوگ ان کے نام، صورت اور آواز سے آشنا تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے شہرت ان کے قدم چومتی اور وہ جو کچھ چاہتے وہ انہیں مل جاتا۔ مگر اس سب کے باوجود ایک خلش انہیں ستاتی رہتی کہ ان کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ اس انجانی خلش سے فرار کے لئے وہ ڈرگ اور سیکس میں بستلا ہوگئے۔ خود ان کے اپنے الفاظ ہیں: "میں ابھی نوخیز نوجوان تھا۔ میڈیا میں ہر جگہ میرا نام اور فوٹو بکھرا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے بہت بڑا بنا دیا تھا اور میں اسی انداز سے جینا چاہتا تھا۔"

اسٹیون کے ہم عصر دوسرے گانے والے بھی کم و بیش اسی طرح کی زندگی بسر کررہے تھے۔ کتنوں نے گھبرا کر خودکشی کرلی۔ خود اسٹیون نے کئی بار خودکشی کا ارادہ کیا۔ نشہ آور دواؤں اور غلط عادات کی وجہ سے انہیں ٹی بی ہوگئی۔ اس وقت انہیں احساس ہوا کہ خود اپنی بھلائی کے لئے زندگی کے رخ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

اسٹیون بنیادی طور پر مذہبی انسان تھے۔ میوزک، ڈرگ اور سیکس نے تھوڑے عرصے کے لئے انہیں ان کے اصل راستے سے ہٹا دیا تھا۔ ٹی بی میں بستلا ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ مذہب کی طرف رجوع کیا۔ خود ان کے اپنے الفاظ ہیں: "میں خدا میں یقین رکھتا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا اظہار کس طرح کیا جائے۔" انہوں نے مختلف عالمی مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ اسی دوران ان کے بھائی مقدس یروشلم گئے جہاں انہوں نے اسٹیون کی مذہبیت کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے قرآن کا ایک نسخہ خرید لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۷۵ء کا ہے۔ قرآن کے مطالعے نے اسٹیون کی کایا پلٹ دی اور وہ ۱۹۷۷ء میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ ان کا اسلامی نام یوسف اسلام ہے۔

۱۹۷۷ء میں اسلام لانے کے وقت یوسف دولت اور شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ مگر اس کے بعد انہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کے لئے وقف کردی۔ انہوں نے گانے کو خیرباد کہہ دیا۔ حال ہی میں تقریباً ۱۷ سال بعد انہوں نے ایک نیا البم تیار کیا ہے جس کا نام ہے The Life Of The Last Prophet

یہ ۶۶ منٹ کا ایک کیسٹ ہے جس میں یوسف نے اپنی جادو بھری آواز میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی بیان کئے اور تین متعلقہ گانے گائے ہیں۔ ۴۷ سالہ یوسف کا کہنا ہے کہ یہ ان کی زندگی کی سب سے اہم ریکارڈ بک ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: "اگر اب آپ میرے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو اس کیسٹ کو سنیں۔" حال ہی میں اس کیسٹ کو فروغ دینے اور لندن میں ایک مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے وہ ملیشیا کے دورے پر تھے جہاں انہوں نے مختلف بڑے

باقی ص۱۵ پر